میں ان کے سفر اور قیام بھوپال کے دلچسپ حالات تحریر کیے گئے ہیں، اس میں اور بھی مفید معلومات آگئے ہیں،

دیوان المعلم عبد الحمید الفراہی - مرتبہ مولانا بدر الدین اصلاحی، تقطیع خورد، عمدہ ٹائپ، صفحات ۳۲، قیمت ۸؎ پتہ: دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ شعر و ادب کا نہایت اعلیٰ اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، اور اردو، فارسی و عربی تینوں زبانوں میں داد سخن بھی دیتے تھے، دائرہ حمیدیہ نے ان کا مختصر عربی دیوان شائع کیا ہے، جو زیادہ تر جنگ طرابلس، غزوۂ بلقان اور ترکوں پر عیسائیوں کے مظالم سے متعلق اشعار اور حکیمانہ کلام پر مشتمل ہے، مرتب نے مقدمہ میں مولانا کے کلام کی مختصر خصوصیات تحریر کی ہیں، امید ہے کہ عربی زبان و ادب کے شائقین کے حلقہ میں یہ مجموعہ مقبول ہوگا،

چند دن دیار غیر میں - مرتبہ مولانا عبد اللہ عباس ندوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۹۶ قیمت ۲ روپیہ ۵۰ پیسے پتہ دار الاشاعت رحمانی، مونگیر۔

مولانا عبد اللہ عباس نے پہلی مرتبہ یورپ کے بعض ملکوں کا سفر کیا تھا، اس سفر نامہ میں انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں اس سفر کے کوائف و تاثرات قلمبند کیے ہیں، اس سے یورپ کی تعلیم، معاشرت اور بعض تعلیمی اداروں اور دوسری متعدد چیزوں کے متعلق بڑے مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتے ہیں، مولانا وسیع النظر عالم اور راسخ العقیدہ مسلمان بھی ہیں، اس لیے یورپ پر اس حیثیت سے بھی نظر ڈالی ہے، اس لیے اس سفر نامہ میں مغربی تہذیب کے روشن اور تاریک دونوں رخ سامنے آجاتے ہیں، جن سے بعض مفید نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

"ض"

جلد ۱۰۰ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۷ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

کاروانِ شبلی کا آخری مسافر

دار المصنفین کے تین معمار تھے، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبد السلام صاحب ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی، اول الذکر دونوں بزرگ بہت پہلے اس دنیا سے اٹھ چکے تھے، اس قافلہ کے آخری مسافر مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے بھی، ۲۰ اگست کو جنت کی راہ لی، ان تینوں نے مل کر دار المصنفین کو پروان چڑھایا تھا، حضرت سید صاحب اور مولانا عبد السلام صاحب نے علمی حیثیت سے دار المصنفین کا نام اونچا کیا اور اسکی شہرت کو عالمگیر بنایا اور مولانا مسعود علی صاحب نے انتظامی حیثیت سے اس کو ترقی دی اور اس کا مقامی وقار قائم کیا۔

مرحوم سراپا قوت و عمل تھے، انھوں نے اپنے دور میں بڑے بڑے عملی کام کیے اور مولانا شبلی سے نسبت رکھنے والے اداروں کو فائدہ پہنچایا، دار المصنفین کی تمام عمارتیں، دار العلوم ندوۃ العلماء کی عالیشان مسجد، شبلی کالج کا کانوکیشن ہال انہی کے ذوق تعمیر کی یادگار ہیں، جب تک یہ عمارتیں قائم ہیں انکا نام زندہ رہے گا، ایک زمانہ میں سیاسی اور قومی کاموں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا، خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے زمانہ میں سید صاحب کی شخصیت اور مولانا مسعود علی صاحب کی عملی جد و جہد نے دار المصنفین کو سیاسی کاموں کا مرکز بنا دیا تھا، اس زمانہ کا کوئی بڑا لیڈر ایسا نہیں ہے جس نے دار المصنفین کا طواف نہ کیا ہو، ان سب سے مولانا کے دوستانہ تعلقات تھے، پورے ضلع میں انکا حکم چلتا تھا، یہاں کے سارے کاموں کے روح رواں وہی تھے، انکے بغیر کسی تحریک میں جان نہیں پڑتی تھی، اب تو زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے، ایک زمانہ میں وہ اعظم گڈھ میں تہذیب کے بھی معلم سمجھے جاتے تھے، انھوں نے یہاں کا تہذیبی معیار بلند کر دیا تھا، غرض ایک عرصہ تک وہ اعظم گڈھ کی پوری زندگی پر چھائے رہے، انکے یہاں ہر وقت ایک دربار لگا رہتا تھا۔

ان میں فطری دبدبہ تھا، عملی کاموں میں ان کی انتظامی قابلیت سے زیادہ انکا دبدبہ کام دیتا تھا، بڑے خوش سلیقہ خوش مذاق اور خوش گفتار تھے، جس محفل میں بیٹھتے تھے اپنی باتوں سے چھا جاتے تھے، رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ بڑی سے بڑی شخصیت سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے اور نہ دبکر ملے، ادھر دس بارہ سال سے انکی علالت کا سلسلہ چل رہا تھا، اور وہ دار المصنفین کے کاموں سے بھی معذور ہو گئے تھے، کئی سال سے بالکل صاحب فراش تھے، آخری چند مہینوں میں ہوش و حواس نے بھی جواب دیدیا تھا اور وہ زندگی کا محض سایہ رہ گئے تھے لیکن یہ سایہ بھی بہت غنیمت تھا، افسوس ہے کہ وہ بھی ختم ہو گیا اور دار المصنفین کے عہد گل کی آخری یادگار بھی مٹ گئی۔ والبقاء للہ وحدہ، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حسنہ کے صلہ میں ان کی مغفرت فرمائے۔

خرطوم کانفرنس ختم ہو گئی، اس کو نہ کامیاب کہا جا سکتا ہے اور نہ ناکام، اس نے اسرائیل کو تو تسلیم نہیں کیا لیکن موجودہ حالات میں عربوں میں اسرائیل کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے، اس لیے بیشتر حکومتوں کا رجحان جنگ کے بجائے سیاسی حل کی طرف رہا، اس میں ناصر جو اسرائیل کے سب سے بڑے مخالف تھے، سب سے آگے تھے، بظاہر اسرائیل سے باعزت سمجھوتے کے سوا سیاسی حل کی اور کوئی شکل نہیں ہے، گو اب بھی عرب حکومتوں میں پائیدار اتحاد نہیں ہے، لیکن اس کانفرنس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انھوں نے سر دست اپنے اختلافات ختم کر دیے، اور سب نے مل کر حالات کا جائزہ لیا اور مناسب فیصلے کیے، شاہ فیصل اور ناصر میں صلح اور یمن کے بارہ میں معاہدہ ہو گیا، اس سے آئندہ پائیدار اتحاد کی راہ نکل آئی ہے۔

کاش ناصر نے پہلے حقیقت پسندی سے کام لیا ہوتا، اور جس نتیجہ پر اب وہ پہنچے ہیں پہلے پہنچے ہوتے، اپنی اور اسرائیل کی قوت کا صحیح اندازہ کیا ہوتا، اس کی مخالفت کا اتنا ڈھول نہ پیٹا ہوتا، اپنی قیادت کے خبط میں عرب حکومتوں میں اختلاف نہ پیدا کیا ہوتا تو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا، آج ان کو وہ سب کچھ کرنا پڑا جس کا سننا بھی ان کو گوارا نہ تھا، انھوں نے اپنی غلطیوں کا اعلانیہ اعتراف کیا، اسرائیل سے جنگ کے بجائے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا، شاہ فیصل سے صلح اور ان کی مالی امداد قبول کی، غرض ؎

آنچہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از خرابی بسیار

سب سے بڑا کام انھوں نے یہ کیا کہ قیادت کے خبط سے دست بردار ہو گئے، مگر ان کے ہندی عقیدت مند اب بھی زبردستی ان کے سر پر قیادت کا تاج منڈھنا چاہتے ہیں جو ان کی غلطیوں کی سزا میں قدرت ان سے چھین چکی ہے، وہ قیادت کے بجائے اسلامی اخوت اور مخلص مشیر کی حیثیت سے عربوں کی زیادہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

ہماری سیکولر حکومت میں مسلمانوں کے خون کی ارزانی کا اب تک وہی عالم ہے، ہر سال دو سال کے بعد ملک کے کسی نہ کسی حصہ کی زمین ان کے خون سے سیراب کیجاتی ہے، اس مرتبہ رانچی کی باری تھی جس نے کلکتہ اور راوڑکیلا کے واقعات کی یاد تازہ کر دی، مقتولین کی تعداد کئی سو بتائی جاتی ہے، جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، ان میں عورتیں، معصوم بچے اور میڈیکل کالج کے مسلمان طالب علم بھی ہیں، مالی تباہی و بربادی کا کچھ اندازہ نہیں کیا جا سکتا، یہ فساد اتنا سنگین تھا کہ وزیر داخلہ تک کو اس کی سنگینی اور فرقہ پروروں کی فتنہ انگیزی اور درندگی کا اعتراف کرنا پڑا، فرقہ پرور مدتوں سے اپنی سیاست کا کھیل مسلمانوں کے خون سے کھیل رہے ہیں، مگر مسلسل تجربہ کے بعد بھی حکومت کو سبق حاصل نہیں ہوتا، اصل یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے خون کی کوئی قیمت نہیں رہ گئی ہے، ورنہ اس قسم کے فسادات کب کے ختم ہو چکے ہوتے۔

~~~~~~~~

زبان کے مسئلہ پر جنوبی ہند میں کتنا بڑا انقلاب ہو گیا، پنجابی کے لیے کیسے کیسے ہنگامے ہوئے، حکومت کو مجبور ہو کر پنجابی زبان کا مستقل صوبہ بنانا پڑا، مگر کسی جن سنگھی نے اسکے خلاف مورچہ نہیں قائم کیا، آئے دن بڑے بڑے مسلمان گھرانوں کی لڑکیاں ہندوؤں سے شادیاں کرتی رہتی ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی، کشمیر میں ایک ہندو لڑکی نے ایک مسلمان سے شادی کر لی کہ قیامت آگئی اور حکومت کو کشمیری پنڈتوں کے ناجائز مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑا، اس واقعہ سے کشمیر کی حکومت کو بھی اپنے معیاری سیکولر حکومت ہونے کا بودا تجربہ ہو گیا ہوگا، ایک واقعہ ہو تو کہا جائے، سیکولر ہندوستان قدم قدم پر دو قومی نظریے کا ثبوت دے رہا ہے، لیکن رانچی کے مسلمانوں کا خون رائیگاں نہ جائیگا، انشاء اللہ اس سے اردو کا چمن شاداب ہوگا، اصل توڑ کا یہی وقت ہے، اس لیے پوری قوت سے اردو کی جد وجہد جاری رہنا چاہیے۔

مقالات

اسلام اور علم ہیئت کے نئے مسائل

از

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس

جون ۱۹۶۷ء میں رصدگاہ پارس کے قیام پر تین صدیاں گزریں، اس تقریب میں وہاں ایک نمائش ہوئی، اس علم سے اپنی ناواقفیت کے باوجود اس کی روز افزوں اہمیت مجھے وہاں کشاں کشاں لے گئی۔

نمائش میں پرانا سامان بھی تھا اور جدید ترین آلات بھی، مثلاً چاند ہی نہیں دیگر ستاروں کی سطح کے کس طرح فوٹو لیے جاتے اور ان کی مٹی کی تحلیل کی جاتی ہے (ان کی روشنی کے رنگ کی مدد سے)، اور وہاں کے پہاڑ اور غار ناپے اور گنے جاتے ہیں،

نمائش میں ایک عربی اصطرلاب (جس پر کوفی خط کی عبارت سے گمان ہوتا ہے کہ اندلس سے آیا ہوگا) اور علم ہیئت کا ایک فارسی مخطوطہ بھی رکھے گئے تھے، جہالت تو نہ ہوگی تعصب ہی ہوگا کہ اور چیزوں کے برخلاف ان دونوں پر توضیحی چٹیاں نہ تھیں، مگر بہر حال فرنگی سامان کو چھوڑ کر اگر کسی اچھی چیز نے وہاں جگہ پائی تو وہ مذکورہ اسلامی چیزیں ہی تھیں،

مجھے معلوم نہیں سب سے پہلی اسلامی رصدگاہ کب اور کہاں کھلی تھی، کہتے ہیں کہ ابن رشد نے
~~~~~~~~

اندلس میں دوربین کے بغیر ہی سورج میں دھبوں کا پایا جانا معلوم کیا تھا، بیسیوں ستاروں کے نام آج بھی فرنگی زبانوں میں عربی ہی میں ہیں، برطانیہ سے رصدگاہ گرینچ کا ملاحوں کے لیے جو سالنامہ شائع ہوتا ہے اس کا آدھا نام آج بھی عربی میں ہوتا ہے: ناٹیکل المناک (المناخ عربی لفظ ہے) اس کا ایک نسخہ اتفاق سے میز پر ہے، اور اس میں دوران سال میں مشہور و ممتاز ستاروں کے نظر آنے کا زمانہ اور آسمان پر مقام ایک جدول میں درج ہیں، اس فہرست کے ستاون ناموں میں سے سینتالیس عربی میں ہیں، مثلاً: Achernar (آخر النہر)، Aldearan (الدبران) Alphard (الفرد) Alphecca (الفکہ)، Altair (الطیر) Betelgeuse (ابط الجوزاء)، Diphda (ضفدع) Fomalhaut (فم الحوت)، Markab (مرکب) Minkar (منقار) Suhail (سہیل)، Vega (نسر واقع) ـــ ایسی ایک مکمل تر فہرست میں نے ابن قتیبہ کی کتاب الانواء کے ضمیمے میں شائع کی ہے ـــ اور ہمارے اجداد نے اس طرح آسمان پر اپنے کام سے اپنے اَمِٹ نام لکھ دیے تھے، اور اب؟ اب چاند کی بلدیہ اپنے ہاں کی گلیوں کے نام تجویز کر رہی ہے، لیکن ہیئت دانوں کی بستی میں ہمارا کوئی ہم مذہب گویا بستا ہی نہیں ہے۔

غالباً دو ہی چار سال میں آدمی چاند پر چڑھ جائے گا، ممکن ہے امریکی ہو یا روسی یا کوئی اور فرنگی، ممکن ہے کچھ عرصہ بعد سیاحوں میں کوئی مسلمان بھی آ جائے، چاہے وہ اسلامی ملکوں میں سے کسی کا باشندہ نہ ہو بلکہ روسی یا امریکی رعیت ہو، ہمارے ہیئت دانوں اور طیارہ سازوں کو اس میں حصہ لینے کی نوبت نہ بھی آئے تو ہمارے فقہا کو ایک سوال کا جواب جلد دینا ہوگا۔ چاند پر نماز کس قبلے کی طرف رخ کر کے پڑھی جائے؟ زمین کا قبلہ تو میری دانست میں وہاں کام

نہیں دے سکتا، أَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ: (جدھر بھی مڑو ادھر خدا کا چہرہ موجود ہے) اپنی جگہ صحیح ہے، لیکن توحید کے حامل مذہب میں چاند والوں کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مرکز یا قبلہ قرار دینا پڑے گا، اس سوال کا جواب بعد میں بعید تر ستاروں میں پہنچیں بھی تو کام دے سکے گا، دو ایک سال ہوئے، جامعۂ استانبول کے طلبہ نے دریافت کیا تو میں نے عرض کیا تھا کہ چاند کے ہرا روشن ہونے والے حصے کے وسط میں ایک کعبہ قمری قرار دینا، پھر اسے وہاں بنانا مناسب ہوگا، یا کم از کم کعبۂ ارضی کے محاذی تو ہو جائے گا،

ہوائی مسافروں کا وقت نماز و افطار

ایک اور عملی مسئلہ اب ہر روز پیش آ رہا ہے، زمین کے گول ہونے کے باعث آفتاب کے طلوع و غروب کا وقت ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا، خط استوا پر جہاں محیط ارضی سب سے زیادہ طویل ہے، ہر ہزار میل پر ایک گھنٹے کا فرق ہو جاتا ہے، اس کے آگے قطب کی طرف جتنا بڑھیں گے، وقت کا اتنا فرق اس سے بھی کم تر مسافت پر ہونے لگتا ہے، کلکتہ اور لندن میں طلوع یا غروب آفتاب میں کوئی ساڑھے پانچ گھنٹے کا فرق ہے، ہوائی جہازوں کی تیز رفتاری کا اب یہ عالم ہے کہ یہ مسافت سات آٹھ گھنٹوں میں طے ہو جاتی ہے، اور موجودہ زیر تعمیر طیارے آ جائیں تو شاید تین چار گھنٹے ہی کافی ہو جائیں گے (پارس سے استانبول کو ایک گھنٹہ کافی ہونا بتایا جا رہا ہے) اس کا نتیجہ؟ فرض کیجئے کہ لندن سے سحری کر کے صبح کے سات بجے اڑیں اور سات گھنٹوں کی پرواز کے بعد لندن کے ۱۴ بجے لیکن کلکتہ کے ساڑھے انیس بجے (شام کے ساڑھے سات بجے) کلکتہ میں اتریں تو افطار کس وقت پر کیا جائے؟ لندن کے حساب سے یا کلکتہ کے حساب سے؟ اس پرواز میں غالباً سورج راستے میں طیارہ والوں کو ڈوبتا ہوا نظر آ چکا ہوگا، فرض کیجئے آفتاب چھ بجے ڈوبا، جب کہ لندنی مسافر نے مشکل سے پانچ چھ گھنٹے امساک کیا ہے، تو یہ روزہ بہت مختصر ہوگا، اگر کلکتہ پہنچنے کے بعد کے دوسرے دن سے یہاں بحث نہیں اور نہ یہ ٹالنے والا جواب کافی ہو کہ

سفر میں روزہ معاف ہے)، اس کے برعکس کلکتہ سے لندن جانے کے لیے صبح سات بجے اڑیں اور
سات گھنٹوں کی پرواز کے بعد لندن پہنچیں تو کلکتہ میں تو ۲ بجیں گے لیکن لندن میں صبح کے ساڑھے
آٹھ ہی بجے ہوں گے، اور اگر اس دن لندن میں موسم بہار کے باعث آفتاب شام کے چھ بجے بھی ڈوبتا ہو
تو مزید ساڑھے نو گھنٹے انتظار کرنا ہوگا، اور سحری اگر صبح چار بجے کی تھی تو پرواز شروع ہونے تک کے
تین گھنٹے، پرواز کے سات گھنٹے اور افطار تک کے مزید ساڑھے نو گھنٹے (۳ + ۷ + ۲/۱۹ ۲/۱ جملہ)
۲/۱ ۱۹ گھنٹے کا روزہ ہوگا، جو بہت زیادہ ہے، یہ تو آجکل پیش آرہا ہے اور وہ دن قریب ہو کر
کلکتہ سے صبح کے سات بجے اڑیں تو چھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جب مغربی ملک میں پہنچیں گے وہاں
بھی صبح ہی کے سات بجے ہوں گے، (بات یہ ہے کہ محیط ارضی چوبیس ہزار میل ہے، اس لیے خط استوا
پر فی گھنٹہ ہزار میل کی مسافت سے پرواز کریں تو زمین کی گردش محوری کی رفتار اور ہماری رفتار پرواز
یکساں ہونے سے، مشرق سے مغرب کی طرف جانے والے کے لیے سورج اپنی جگہ سے حرکت نہیں
کرتا، کلکتہ اور لندن خط استوا سے دور ہیں اس لیے اس سے بھی سست تر رفتار طیارہ سے وہی نتیجہ
نکلتا ہے، اور اگر طیارے کی رفتار زمین کی اپنی رفتار سے تیز تر ہو جائے، جیسا کہ فوجی طیاروں میں اب
ہو بھی چلا ہے، تو مسافر کو راستے میں آفتاب "مشرق" (۱) میں ڈوبتا نظر آئے گا۔ اور مثلاً کلکتہ سے صبح کے
سات بجے نکلیں تو سات گھنٹوں کی پرواز کے باوجود مغربی منزل مقصود میں "قبل از وقت" پہنچیں گے،
یعنی صبح کے مثلاً چار بجے ہوں گے اور آفتاب ابھی نکلا ہی نہ ہوگا، اور اگر مغرب سے مشرق کو جائیں تو
آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا مشاہدے میں آئے گا جس کا احادیث میں ذکر ہے)، فَتَبَارَكَ اللّٰهُ
اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ اللہ ہی سب سے بہتر خالق ہے، بابرکت وہی ہے، بیچارہ انسان
تو ناچیز ہی رہے گا۔

گذشتہ سال ایک صاحب رمضان میں شاید ڈھاکہ سے جنیوا آئے تھے، انھیں ایسا ہی

"حادثہ" پیش آیا، ان کی فتویٰ طلبی پر کیا جواب دیں؟ منزل روانگی کے وقت کے حساب سے وہ افطار
کریں یا منزل ورود کے؟ اسی طرح سیلون سے روس کو، ارجنٹائن سے کنیڈا کو پرواز کریں تو
وقت کا اتنا کثیر فرق ہوتا ہے کہ آدمی دم بخود ہو جاتا ہے، غالباً معقول جواب یہی سمجھا جائے گا کہ
دوران پرواز میں منزل روانگی کا وقت ہی نماز اور روزہ کے لیے ملحوظ رکھا جائے، مقامی وقت
نہیں، یعنی نہ دوران پرواز کے جگہ جگہ بدلنے والے وقت کا، نہ منزل ورود کا، اگر ایسا نہ کریں تو
اسپوٹنک کے مسافر کو جو زمین کے گرد گھومتا ہے، روزانہ آٹھ آٹھ مرتبہ سورج کو طلوع اور
غروب ہوتے دیکھنے کا موقع ملتا ہے، اور تین گھنٹے ہیں اس کے لیے چوبیس گھنٹوں کی نمازیں اور
روزہ رکھنا معقول نہیں ہو سکے گا۔

ہجری عیسوی تقابلی جنتریاں

جہاں ان حال و مستقبل کی چیزوں پر توجہ کی ضرورت ہے، وہیں ماضی
کے تحقیقات کی نظر ثانی و تصحیح کے لیے بھی ہمیشہ تیار رہنا چاہیے، تاکہ اگر کوئی انسانی غلطی ہوئی تھی
تو وہ برقرار نہ رہے بلکہ اس کی اصلاح ہو جائے، والعصمۃ للہ، غلطی سے مبرا تو صرف خدا
کی ذات ہے، مثلاً:۔

ان دنوں میں ہجری سنہ کی مطابق تاریخیں عیسوی سنہ میں معلوم کرنے کے مسئلے پر کام کر رہا
ہوں، یورپ میں کم از کم ساڑھے تین سو برس سے اس کام کے لیے تقابلی جنتریاں بنائی جانی شروع
ہوئی ہیں، گذشتہ چودہ سو برس سے، جب سے کہ ہجری سنہ شروع ہوا ہے، "محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ،
رجب، رمضان، اور ذیقعدہ ہمیشہ اور ہر سال تیسے ہوتے ہیں، ذی حجہ کے سوا باقی دوسرے
یعنے انتیسے، اور صرف ذی حجہ بعض قواعد کے تحت کبھی انتیسا، کبھی تیسا ہوتا ہے"، یہ ہے وہ فرنگی
"تحقیق" (جس میں اور تو اور، خود رمضان بھی ہمیشہ تیسا ہوتا ہے)، میں نے انگریزی، فرانسیسی،
جرمن، اسپینی، اطالوی، رومانوی اور روسی (اور ان کے ترجموں) میں پڑھی ہے، اس طرح کا

ایک ترجمہ اردو میں ایک پرانے رفیق پروفیسر خالدی نے انجمن ترقی اردو کے لیے شائع کیا تھا،،
اس وقت یہاں نہیں ہے کہ تحقیق کرسکوں، مگر خوف ہے کہ انھوں نے بھی ویسی کیا ہوگا جیسا کہ
ایک ترکی "فاضل" نے کیا ہے۔

اس پر رؤیں یا ہنسیں؟ ان مغربی محققوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ بعض وقت مسلسل تین تین
مہینے تیسے، یا یا تین تین مہینے انتیسے بھی ہوتے ہیں، اور یہ علم ہیئت کے مسلمات میں سے ہے، اور
مشاہدہ بھی، رصد گاہ استانبول کے ریکارڈ میں لکھا ہے کہ ابھی چند سال قبل ترکی میں ایک مرتبہ
مسلسل چار مہینے تیسے ہوئے۔

بہرحال مذکورہ تقابلی جنتریوں کی غلط نویسی کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کسی پرانی اسلامی کتاب
میں کسی واقعے کی تاریخ دن کی صراحت کے ساتھ ہو، اور ان فرنگی ملاؤں کی جنتری میں وہ دن
مذکور نہ ہو تو اسلامی مورخ غلط بیان یا کم از کم سہل انگار قرار پاتا ہے، جنتری غلط نہیں سمجھی جاتی
(مثلاً میرے سامنے اس وقت کاتنوز کی ایک ایسی فرانسیسی تقابلی جنتری ہے، حجۃ الوداع ۱۰ھ
میں جمعہ کے دن ہوا تھا، لیکن یہ جنتری کہتی ہے کہ اس سال جمعہ کے دن ذی حجہ کی آٹھویں تھی۔
یا یہ کہ امام حسینؓ کی شہادت ۱۰ محرم ۶۱ھ کو جمعہ کے دن ہوئی، لیکن یہ جنتری اسے جمعہ نہیں
بدھ کے دن قرار دیتی ہے۔

کیا یہ ضرورت نہیں کہ مسلمان ہیئت دان ایسی تقابلی جنتری خود بنائیں اور صحیح تر بنائیں؟
اسی مذکورہ علمی کام کے سلسلے میں محمود پاشا فلکی کی شہرہ آفاق کتاب "نتائج الافہام" اور
اس کی فرانسیسی اصل کو بھی دیکھا، اس کتاب پر "سیرۃ النبی" میں شبلی مرحوم اور سید سلیمان ندوی مرحوم
نے کافی اعتماد کیا، اور اس کی ثناخوانی کی ہے، گذشتہ صدی کے اس سب سے بڑے مسلمان ہیئت دان
پر مجھ جیسے اس علم سے نابلد شخص کی طرف سے تنقید ایک بیجا جسارت سمجھی جائے گی، لیکن میں اپنی

تنقید کو تردید نہیں، سوال کے طور پر ہیئت دانوں اور مورخوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں،
گاہ باشد کہ کودک ناداں الخ
وہ لکھتے ہیں کہ (۱) ولادت نبوی ۲۰ راپریل ۵۷۱ء کو ہوئی، اور یہ کہ اسلام سے پچاس
سال قبل سے نسی (کبیسہ گری) کا مکہ میں رواج باقی نہ رہا تھا، بلکہ خالص قمری سال پایا جاتا تھا،
(۲) ہجرت میں رسول اکرمؐ کا مدینہ میں ورود مبارک یوم عاشورہ کو ہوا، جو محرم میں نہیں ربیع الاول
میں پایا جاتا ہے، اور (۳) رسول اکرمؐ کے فرزند دلبند حضرت ابراہیمؓ کی وفات ۲۹ شوال
۱۰ھ کو ہوئی،
دلیلیں؟ "ولادت نبوی کے متعلق چوتھی پانچویں صدی ہجری کے مسلمان ہیئت دانوں نے
جو زائچے بنائے ہیں ان سے یہی ثابت ہوتا ہے"۔ ولادت مبارک کے دن غفر ستارے کے
طلوع کا ذکر تو میں نے بعض حدیثوں میں پڑھا ہے (جس سے محمود فلکی نے بحث نہیں کی ہے)
لیکن دوسرے ستاروں کے قران السعدین کا یا ان کے فلاں فلاں مقام پر ہونے کا ذکر
نہ قرآن مجید میں ہے نہ کسی حدیث میں میری نظر سے گزرا ہے، گمان یہ ہوتا ہے کہ اولاً ہمارے ان
پرانے مسلمان زائچہ نویسوں نے ایک مفروضے کی اساس پر ولادت نبوی کی تاریخ خود معین کی
اور پھر اس تاریخ کا زائچہ بنا ڈالا، لیکن اگر ابتدائی مفروضہ ہی غلط رہا ہو تو اس کا نتیجہ کیسے
صحیح ہو جائے گا؟ پہلا ہجری سال ۶۲۲ء سے ہونا معلوم و معین ہے، رسول اکرمؐ کی
ولادت ربیع الاول کے مہینہ میں ہونی مروی ہے، اس مبارک واقعہ کے چالیس سال
اور چھ ماہ بعد بعثت ماہ رمضان میں ہوئی، پھر مزید بارہ سال چھ ماہ بعد ہجرت نبوی تو ہوئی
لیکن سنہ ہجری کا آغاز بعثت کے بارہ سال تین ماہ بعد ہی ہو گیا، غرض ۴۰ سال چھ ماہ + ۱۲ سال
تین ماہ = باون سال نو ماہ ہوتے ہیں، اگر ۶۲۲ء میں سے باون سال ہی حذف کریں تو

۵ھ ہونا چاہیے، ۱۱ھ نہیں۔[1] سب لوگ جانتے ہیں کہ کبیسہ گری (نسی) کو منسوخ کرنے کا حکم حجۃ الوداع میں دیا گیا، ولادت نبوی سے حجۃ الوداع تک نہ بھی لیں تو، ولادت سے ہجرت تک کے باون سالوں میں مکہ میں نسی ہوتی رہی، اور اس مدت کو خالص قمری شمار کرنا صحیح ہوگا کہ باون قمری سالوں کے اکاون شمسی سال قرار دیے جاسکیں، اگر زائچہ بنانے والوں نے کسی سہو سے باون کبیسہ والے سالوں کو باون قمری سال فرض کیا اور پھر اس مفروضے کی اساس اس کی معادل چیزیں ڈھونڈھ نکالیں کہ کسریٰ کا سنہ جلوس کونسا تھا، سنہ سکندری کی کیا تاریخ تھی، وغیرہ تو یہ ساری چیزیں ثبوت کی محتاج ہوں گی، تاریخی واقعے کی اساس نہیں، گھڑیاں توپ کے چلنے پر درست کی جاتی رہیں اور توپ بھی ان ہی گھڑیوں کی اساس پر چلتی رہے تو وقت کے صحیح ہونے کا کیا ثبوت؟

دوسرا مسئلہ: "مدینۂ منورہ میں ورود مبارک یوم عاشورا کو ہوا"، محمود فلکی نے لکھا ہے کہ سیرۂ حلبیہ میں کسی حافظ بن ناصر الدین کا بیان ہے کہ "قدم المدینۃ یوم عاشوراء" (عاشورے کے دن مدینہ تشریف لائے) اور اس کی صحت کا یہ ثبوت کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں ہے، فلکی پاشا نے اسی پر اکتفا کی اور بخاری و مسلم میں تحقیق نہ کی۔ ان ماخذوں میں باوجود تلاش کے مجھے یہ الفاظ نہ ملے (مفتاح کنوز السنۃ نامی حدیثوں کے انڈکس میں بھی اسکا ذکر نہ ملا) بخاری و مسلم میں ملے تو یہ الفاظ کہ "قدم النبی علیہ السلام فرأی الیھود تصوم یوم عاشوراء" (نبی علیہ السلام مدینہ آئے تو دیکھا کہ یہودی عاشورے کے دن روزہ رکھتے ہیں) یا یہ حدیث کہ "دخل المدینۃ واذا اناس من الیھود یعظمون عاشوراء ویصومونہ" (مدینہ تشریف لائے تو حال یہ تھا کہ وہاں کچھ یہودی عاشورے کا احترام کرتے اور اس دن روزہ

---

[1] میرے حساب سے تو یہ جولائی ۶۲۹ء کا واقعہ ہے۔

رکھا کرتے تھے)، حافظ بن ناصر الدین صاحب کو غلط فہمی ہوئی اور ان کی عبارت غلط فہمائی کا باعث ہوئی ہے، ورنہ بخاری و مسلم کی روایتوں کا اطلاق محرم ۲ھ پر بھی بغیر کسی دشواری کے ہوسکتا ہے، اور غالباً ہونا بھی چاہیے، بخاری و مسلم کی ایک اور روایت سے بھی اسی خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ "ارسل النبی علیہ السلام غداۃ عاشوراء الی قری الانصار من اصبح مفطرا فلیتم بقیۃ یومہ ومن اصبح صائما فلیصم" (عاشورے کے دن نبی علیہ السلام نے چاشت کے وقت انصار کی بستیوں میں آدمی بھیجے کہ جو کوئی ناشتہ کرچکا ہو تو بھی وہ باقی دن روزہ رکھے اور جس نے ابھی کچھ نہ کھایا ہو تو سارا دن روزہ رکھے)۔ ہجرت کے دن ورود نبوی قبا میں دوپہر کے وقت ہوا، اسی دن سویرے روزے کا حکم بھیجنا ممکن نہیں، اور ساری غلطی حافظ بن ناصر الدین کے سہو پر مبنی معلوم ہوتی ہے، اس پر مزید بحث نیچے آتی ہے۔

تیسرا مسئلہ: فرزند نبوی حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے دن سورج گرہن ہوا تھا، فلکی پاشا نے اسے ۲۷ جنوری ۶۳۲ء مطابق ۲۹ شوال ۱۰ھ کو قرار دیا، اور اس پر بہت اصرار بھی کیا ہے۔ کشافہ (اسکاوٹنگ) کے زمانے میں علم ہیئت کی جو شُد بُد تعلیم حاصل کی تھی وہ اتنے بڑے علمی مسئلے میں کام نہیں دیتی، اس لیے خود حساب کرکے علم الیقین کے ساتھ بیان کرنے کی جگہ مجبور ہوں کہ غیروں کی خوشہ چینی کروں، ذمہ داری ان ہی پر ہے، بہرحال فرانسیسی میں گمنام پادریوں کی ایک پرانی متداول کتاب ہے "تقابلی تاریخیں معلوم کرنے کا فن" (L. Art de verifier les dates)۔ اس کی جلد اول میں حضرت عیسیٰؑ کے زمانے سے اب تک سارے چاند گرہنوں اور سورج گرہنوں کی تاریخ و تفصیل دی گئی ہے۔ عہد نبویؐ کے مدنی دور کے گرہنوں کا ذکر اس کتاب میں جلد اول صفحہ (۶۴) پر ہے۔ فی الحال کوئی اور ماخذ معلوم نہیں جس کی مدد سے صحت کی جانچ کرسکوں، اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

محمود فلکی کا بیان کہ حضرت ابراہیمؑ بن رسول اللہؐ کی وفات ۲۹ شوال ۱۰ھ کو ہونی چاہیے، اس کی کوئی سند اسلامی تاریخوں میں نہیں ملتی، اس واقعے کے متعلق جو اختلاف رائے ہے، اس کا خلاصہ بلاذری کی انساب الاشراف (ج ۱ ص ۴۴۹ تا ۴۵۲، طبع مصر) اور ابن عبد البر کی الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ج ۱، سوانح نمبر ۱، طبع حیدرآباد دکن) میں ملتا ہے۔

ابن عبد البر نے اور روایتوں کے ساتھ یہ ضعیف روایت بھی نقل کی ہے کہ یہ وفات ذی حجہ ۸ھ میں ہوئی۔ سورج گرہن چونکہ قمری مہینے کے آخر ہی میں ہو سکتا ہے، اس لیے مراد ذی حجہ کی آخری تاریخ ہی ہوگی۔ اگر اس روایت میں مکہ والوں کی کبیسہ گری ملحوظ رکھی گئی ہے تو یہ ۲۱ یا ۲۲ مارچ ۶۳۰ء کو ہونا چاہیے، اور اگر کبیسہ گری کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ خالص قمری سال کی تاریخ مراد ہے، تو یہ ۱۸ یا ۱۹ اپریل کو ہوا ہے، مگر مذکورہ فرانسیسی کتاب کی جدول میں اگست ۶۲۹ء اور اگست ۶۳۰ء کو تو سورج گرہن بتائے گئے ہیں، لیکن مارچ یا اپریل ۶۳۰ء میں کوئی نہیں۔ ابن عبد البر کی دوسری روایت جس سے سارے ہی سیرت نگار متفق ہیں، یہ ہے کہ یہ ذی حجہ ۸ھ اصل میں صاحبزادے کی ولادت کی تاریخ ہے، سورج گرہن بخاری وغیرہ سب کے مطابق ان کی وفات کے دن ہوا، یہ وفات بلاذری کی ایک روایت میں ۱۷ دن کی عمر میں ہوئی، یعنی صفر ۹ھ کے آخر میں، مکی حساب سے یہ ۱۹ مئی ۶۳۰ء کو اور خالص قمری حساب سے تقریباً ۱۷ جون ۶۳۰ء ہوگا، ان دونوں تاریخوں میں دنیا میں کوئی سورج گرہن نہیں ہوا، دوسری روایت جو مصعب اور ابن اسحٰق کی ہے، وفات کو اٹھارہ ماہ کی عمر میں بتاتی ہے، یعنی جمادی الآخرہ ۱۰ھ جو کبیسہ اور غیر کبیسہ دونوں حسابوں سے ایک ہی تاریخ یعنی ۳ ستمبر ۶۳۱ء کو ہوتی ہے، اور اس تاریخ کو بھی کوئی سورج گرہن دنیا میں نہیں ہوا، تیسری اور آخری روایت سولہ ماہ کی عمر میں وفات کی ہے، اور بلاذری نے

صراحت بھی کی ہے کہ یہ ربیع الثانی کی آخری تاریخ کو پیش آئی[1]، یہ تین اگست ۶۳۱ء کے مطابق ہے، اور واقعی اس تاریخ کو ایک سورج گرہن ہوا بھی ہے، ابوداؤد کے مطابق سخت گرم دن کا واقعہ ہے، اور اگست میں گرمی ہی ہوتی ہے، پیش نظر فرانسیسی جدول کے مطابق یہ گرہن "اسپین کے جنوب اور وسطی افریقا" میں نظر آسکتا تھا، کتاب میں عرب کی صراحت نہیں ہے، لیکن غالباً اس میں کوئی مانع بھی نہیں، واحد پیچیدگی یہ ہے کہ بخاری کے مطابق یہ صبح چاشت کے وقت کا واقعہ ہے اور فرانسیسی جدول میں گرہن پاریس کے حساب سے بعد ظہر ڈھائی بجے شروع ہوا، یعنی مدینہ منورہ میں عصر کے وقت، میں نہیں جانتا فرانسیسی جدول میں کوئی سہو ہے یا نہیں، مگر فی الحال اسی کو قبول کرنا پڑتا ہے، محمود فلکی نے شوال ۱۰ھ مطابق ۲۷ جنوری ۶۳۲ء کو جو ذکر کیا ہے، وہ اس فرانسیسی جدول کے مطابق "جنوب مشرقی افریقا سے مشرقی ایشیا تک" دیکھا جا سکتا تھا، اور پاریس کے حساب سے صبح ساڑھے چھ بجے شروع ہوا تھا، یہ مدینہ منورہ میں کوئی نو بجے چاشت کا وقت ہوگا، لیکن جنوری سخت سردی کا زمانہ ہے، اور یہ ابوداؤد کی صراحت کے خلاف ہے، معلوم نہیں سہو قلم ہے یا کیا کہ اپنی فرانسیسی اور عربی دونوں کتابوں میں محمود فلکی نے لکھا ہے کہ "یہ سورج گرہن آدھی رات کے بعد تقریباً ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوا"، کیا سورج گرہن کبھی رات کو بھی ہوتا ہے؟ کیا آدھی رات کے بعد کبھی ساڑھے آٹھ بھی بجتے ہیں؟ فرانسیسی کتاب تو ان فرنگیوں ہی کے لیے لکھی اور فرانس اور بلجیم دو مقاموں کے علمی رسالوں میں بیک وقت شائع ہوئی، اس میں تو فرنگی حساب ہی ہونا چاہیے، عربی حساب نہیں کہ چھ بجے آدھی رات ہوتی ہو۔

---

[1] واقدی نے ۱۰ ربیع الاول ۱۰ھ لکھا ہے، قمری مہینہ کی دس تاریخ کو سورج گرہن ہو نہیں سکتا، مہینے کے آخر آخر ہی میں ہو سکتا ہے، غالباً "آخر ربیع الاول" کو مولف یا کاتب کے سہو قلم نے عاشر ربیع الاول کر دیا۔ (ربیع الاول میں کوئی گرہن نہیں ہوا)

یہودی سنہ اوپر محمود فلکی کے اس بیان کا ذکر آیا کہ ہجرت نبوی میں ورود مبارک عاشورا کے دن ہوا، جو یہودیوں کے یوم تشری نہیں بلکہ عید الفصح کے مترادف ہے، اور محرم میں نہیں، بلکہ ربیع الاول میں ہوتا ہے۔

نفس قصہ یہ معلوم ہوتا ہے بخاری و مسلم وغیرہ کی جن احادیث شریفہ میں عاشورے کے دن مسلمانوں کو روزہ رکھنے کے حکم کا ذکر ہے، وہاں نہ صرف اس کی صراحت ہے کہ اسلام سے پہلے قریش بھی (حتی کہ مسند احمد بن حنبل، ج ۶، ص ۱۶۲ کے مطابق خود رسول اکرمؐ بھی) زمانۂ جاہلیت میں مکہ معظمہ میں اس دن روزہ رکھا کرتے تھے، بلکہ یہ بھی کہ یہ حضرت موسیٰؑ کے فرعون سے نجات پانے کے شکرانے میں ہے، اور ارشاد نبوی ہوا ہے کہ یہودیوں سے زیادہ مجھے سزاوار ہے کہ اس دن شکرانۂ باری تعالیٰ بجالاؤں۔

محمود فلکی نے فرنگی کتابوں سے بآسانی یہ معلوم کرلیا کہ یہودیوں کے ہاں دو بڑی عیدین ہوتی ہیں: ایک یوم کپور (کفارہ) جس میں چوبیس گھنٹے کا طویل روزہ رکھنا فرض ہے، یہ تقریباً ۱۰ تشری کی دس تاریخ کو ہوتی ہے، لیکن اس کا تعلق فرعون کے ڈوب مرنے سے نہیں ہے، بلکہ یہودیوں کے ہاں بحر احمر کو عبور کرنے کی تاریخ ۱۵ نیساں کو ہے، اسے عید الفصح کہتے ہیں، لیکن اس دن کوئی روزہ نہیں رکھا جاتا۔

ان حالات میں محمود فلکی نے احادیث میں بیان شدہ فرعون سے نجات کے عنصر کو اہمیت دی، روزہ رکھنے کو نظر انداز کرکے ہجرت نبوی میں مدینہ تشریف آوری کو (جو حافظ بن ناصر الدین کے مطابق عاشورے کے دن ہوئی) یوم کپور کی جگہ عید الفصح کے مترادف قرار دیدیا، عید الفصح موسم بہار میں آتی ہے، ربیع الاول کے لفظی معنی بھی موسم بہار پر دلالت کرتے ہیں، لہذا یہ سب ٹھیک بیٹھتا ہے، اور چونکہ یکم محرم سنہ ۱ھ کا تطابق ۱۶ر جولائی ۶۲۲ء سے سمجھا جاتا ہے، اسلیے دوشنبہ ۸ ربیع الاول تک (۶۶) دن ہوتے ہیں، اور اسے انھوں نے ۲۰ر ستمبر ۶۲۲ء کے مطابق قرار دیدیا۔

گر اس استدلال میں (غلطیاں تو کہنے کی مجھے جرأت نہیں)، کئی گتھیاں مجھے نظر آتی ہیں:

(۱) یہودی عید الفصح ماہ نیسان میں ہوتی ہے، اور نیسان کا مہینہ موسم بہار میں آتا ہے، اور اپنے معنے کے لحاظ سے ربیع الاول بھی موسم بہار پر دلالت کرتا ہے، لیکن خود محمود فلکی اسے ۱۰ ستمبر کا مہینہ قرار دیتے ہیں، ستمبر میں خزاں اور پت جھڑ کا موسم ہوتا ہے، بہار کا نہیں، بہار کا آغاز تو نوروز یعنی مارچ کے مہینہ میں ہوتا ہے، اگر فرض بھی کرلیں (جیسا کہ محمود فلکی کو اصرار ہے کہ اہل مکہ اسلام سے پچاس سال قبل ہی سے نسی کو ترک کرچکے تھے) کہ ربیع الاول کا زیر بحث زمانے میں موسم بہار میں آنا ضروری نہیں کیونکہ قمری مہینے جگہ بدلتے رہتے ہیں، تو بھی یہودی نیسان کا بہار میں آنا ضروری ہے، کیونکہ یہودی اپنے قمری سال میں لوند کا مہینہ بڑھاتے رہتے ہیں، لہذا ان کا ماہ نیسان ستمبر میں نہیں آسکتا، دوسرے الفاظ میں ان کی عید الفصح ربیع الاول ۱ھ میں یعنی ستمبر ۶۲۲ء میں ہو نہیں سکتی، یہاں یہ مکرر کہتے چلوں کہ ربیع الاول سنہ ۱ھ اگر تنسیخ نسی کے بعد سے حساب کرکے چلیں تو ۱۳ر ستمبر سے شروع ہوتا ہے، لیکن اگر مکہ والوں کے نسی والے حساب پر باقی سمجھیں، کہ ابھی اسے رسول اللہؐ نے منسوخ نہ فرمایا تھا، تو یہ ربیع الاول ۱۰ر مئی سے شروع ہوا تھا، مکی حساب کا محرم واقعی نیسان یعنی عید الفصح کے مطابق ہے۔

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محرم میں نہیں بلکہ ربیع الاول (مطابق یہودی ماہ سیوان) میں مدینہ تشریف لاتے ہیں۔

(۲) یہودی عید الفصح ماہ نیسان میں ہوتی ہے، جو ان کے سال کا ساتواں مہینہ ہے: (تشری، ہاشیوان، کسلیو، تیبت، شباط، آوار، نیسان، ایار، سیوان، تموز، آب ایلول) ان کے ہاں بھی قمری سال رائج ہے، اور وہ بھی ہر تیسرے سال ایک تیرہواں لوند کا مہینہ بڑھاتے ہیں

یہ اضافہ ماہ آدار کے بعد ویادار کے نام سے ہوتا ہے، لیکن چاند ہو کہ نہ ہو، سال کا آغاز کبھی کسی اتوار، بدھ یا جمعہ کے دن سے نہیں ہو سکتا، اگر رویت ہلال سے ایسا ہو بھی جائے تو نئے سال کی تاریخ ایک دن متاخر کر دیتے ہیں اور سال کبھی ۳۵۳، کبھی ۳۵۴ اور کبھی ۳۵۵ دن کا ہو جاتا ہے، چاہے علم ہیئت مانے یا نہ مانے، غرض ان کے سال کا آغاز، جو ماہ تشری سے ہوتا ہے، کبھی ستمبر اور کبھی اکتوبر میں واقع ہوتا ہے، ہجرت میں رسول اکرمؐ کی مدینہ تشریف آوری اگر واقعی ستمبر میں ہوئی تھی تو یہ ماہ تشری کے مطابق تو ہے، ماہ نیسان کے نہیں، مالر کی یہودی تقابلی جنتری کے مطابق جو جرمن میں ہے (E. Mahler, vergleichungs-Tuballen, wien 1888, P. 77) یکم تشری ۴۳۸۳ھ یہودی کے مطابق تاریخ ۱۱ ستمبر ۶۲۲ء ہے۔ بعد کے خالص قمری حساب سے یکم محرم ۱ھ کے مطابق تاریخ ۱۶ جولائی ۶۲۲ء سمجھی جاتی ہے۔

دوشنبہ کا دن لانے کے لیے محمود فلکی نے ورود مدینہ ۸ ربیع الاول کو قرار دیا ہے، یہ چونکہ یکم محرم سے (۶۷) دن بعد کا واقعہ ہے، اس لیے ۱۶ جولائی کے (۶۷) دن بعد ۲۰ ستمبر کو پیش آنا چاہیے، یعنی ماہ تشری میں، عید کپور کے دو دن پہلے، نہ کہ عبور دریا و غرق فرعون کی عید الفصح کے موقع پر، لیکن اگر مکہ کے کبیسہ والے حساب سے لیں تو ہجرت نبوی ماہ مئی میں ہوگی، ماہ ربیع الاول ۲۰ مئی ۶۲۲ء جمعرات کے دن شروع ہوا تھا، ۱۲ ربیع الاول مطابق ۳۱ مئی بھی پیر ہی کو ہے۔ لہذا اسلامی پرانی روایات کی توثیق ہوتی ہے، اور محمود فلکی کے بیانات غلط ثابت ہوتے ہیں، ماہ مئی مدینہ منورہ میں خاصی گرمی کا ہوتا ہے، اور کتب سیر میں صراحت ہے کہ رسول اکرمؐ کی آمد کے وقت خاصی گرمی تھی، اور انصار دن چڑھنے پر گرمی کے باعث مزید انتظار کیے بغیر گھروں میں واپس چلے گئے تھے، جبکہ حضورؐ کی آمد آمد ہوئی، ماہ مئی یہودی ماہ سیوان میں شروع ہوا تھا جس کو نہ تشری کے روزے سے اور نہ عید الفصح کی تقریب سے کوئی تعلق ہے۔

(۳) یہ امر کہ عاشورا کو یوم کپور کے مترادف سمجھنا چاہیے، عید الفصح کے نہیں، اس کی تائید میں کئی باتیں ہیں:

(الف) یوم کپور ماہ تشری کی دسویں کو ہوتا ہے، اور "عاشورا" کے لفظی معنی بھی دسویں دن ہی کے ہیں، اور جہاں تک میں جانتا ہوں، اسلامی ادبیات و روایات میں اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ عاشورا محرم کی دسویں کو ہوتا ہے۔

(ب) یوم کپور کے موقع پر یہودیوں کے ہاں روزہ رکھنا فرض ہے، اور حدیث شریف میں صراحت ہے کہ یہودی عاشورا کے دن روزہ رکھتے تھے،

(ج) یوم کپور کو فرعون سے نجات پانے سے تعجب تعلق قرار دینا بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا، مجھے عبرانی زبان اور یہودی ادبیات سے واقفیت کا مطلق دعوی نہیں، اب سے پینسٹھ سال پہلے (۱۹۳۳ء میں) جرمنی میں کچھ عبرانی سیکھی تھی، اب تو حروف تہجی بھی مشکل سے یاد ہیں، بہر حال میرے سامنے ۱۹۱۱ء میں پارلیس میں چھپی ہوئی ایک کتاب ہے، جس میں عبرانی دعائیں فرانسیسی ترجمے کے ساتھ دی گئی ہیں، اور کتاب کا نام ہے: "سال کے سارے دنوں میں پڑھی جانے والی دعاؤں کی کتاب" (Debre, Rituel de prieres pour Tous les Jours de l'annee) اس میں ماہ تشری کی دسویں کو یوم کپور کے موقع پر جو دعا پڑھی جاتی ہے، اس کے آخری الفاظ (عبرانی میں صفحہ ۲۴۲ پر اور فرانسیسی میں صفحہ ۲۴۳ پر) یہ ہیں: مقراقدیس ذکرلیصیات مصریم (یعنی اے خدا تو نے اس عید کو "مقدس گردانا ہے کہ وہ مصر سے نجات کی یاد دلاتی ہے")۔ جب یہودیوں ہی کے مطابق یوم کپور کو مصر سے نجات کی یاد سے تعلق ہے تو پھر ہمیں تعجب کیوں ہو کہ حدیث شریف میں رسول اکرمؐ

نے بھی اس کا ذکر فرمایا ہے، صلی اللہ علیہ وسلم

(د) مشرکین مکہ میں بھی اور یہودیوں کے ہاں بھی قمری مہینہ رائج تھا، اس لیے مہینوں کا آغاز گو بالا یہودی استثناؤں کے ساتھ ایک ہی زمانے میں ہوتا تھا، دونوں کے ہاں لوند مہینہ بڑھانے کا رواج تھا لیکن عرب اسے ختم سال پر ذی حجہ کے بعد اور محرم سے پہلے بڑھاتے تھے تو یہودی وسط سال میں چھٹے مہینے آدار کے بعد اور ساتویں مہینے نیسان سے پہلے، مزید برآں وہ لوند کا تیرہواں مہینہ انیس سال میں چھ مرتبہ (تیسرے، چھٹے، آٹھویں، گیارہویں، چودہویں اور انیسویں سال) بڑھاتے ہیں جس کے بعد زمانہ اپنے پرانے حال پر واپس آجاتا سمجھا جاتا ہے، اسکے برخلاف مکہ والوں کی نسی میں یہ عمل کبھی تین برس میں ایک بار اور کبھی دو ہی برس میں ایک بار کرکے تینتیس سال میں بارہ مرتبہ[1] لوند کا مہینہ بڑھایا جاتا اور اس طرح خالص قمری اور لوند والے مہینے مکرر اپنی اصلی حالت پر واپس آتے، (اور بظاہر یہ تیسرے، چھٹے، نویں، گیارہویں، چودہویں سترہویں، بیسویں، بائیسویں، پچیسویں، اٹھائیسویں، تیسویں اور تینتیسویں سال کے اختتام پر بڑھائے جاتے، کم از کم فلکیاتی ریاضیات کے نقطۂ نظر سے اسی طرح بڑھانے کی ضرورت ہے، تاکہ قمری اور شمسی سال میں ایک قمری مہینہ کے اضافہ کے ذریعہ سے فوراً انطباق پیدا ہو جایا کرے، اور مزید انتظار کیے بغیر جیسے ہی ایک مہینہ کا فرق ہو اس کا اضافہ کر لیا جائے) ان فرقوں کے باعث اگر کسی زمانے میں عربی اور یہودی سالوں کا آغاز ایک ہی زمانے سے ہوا بھی تھا تو یہ ضروری نہیں رہتا کہ وہ ہر زمانے میں یکساں رہیں، اور اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ مشرکین مکہ کا محرم اور یہودیوں کا تشری الگ الگ زمانے میں آئیں، ہم ابھی اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ایک حساب سے (جو ہماری رائے میں غلط ہے) ربیع الاول سنہ ۱ھ میں تشری ہی کا مہینہ چل رہا تھا، اور اگر محمود فلکی کی اس تجویز کو قبول کر لیا جائے (جو ہماری رائے میں درست نہیں) کہ رسول اکرمؐ کا مدینہ میں ورود مسعود ۸ ربیع الاول ہی کو ہوا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ تشری کی آٹھویں کو وہاں پہنچے تھے، لہٰذا یوم کپور کو ابھی دو دن باقی تھے،

[1] اصل میں تیس سال کا دور تھا اور اس میں گیارہ مرتبہ نسی ہوتی تھی، لیکن سال کے بارہ مہینوں کی کامل گردش کے لیے میں نے (۳۳) سال کا ذکر کیا ہے، تینتیسویں سال کی نسی نئے دور کا آغاز کرتی، اس فرق کی اہمیت یہ ہے کہ ہر دور میں نسی کرنے کے سالوں کی ترتیب مقرر ہے، جیسا کہ آگے تفصیل ہے۔

حافظ ابن ناصر الدین کی روایت پھر بھی غلط ہی رہے گی کہ رسول اکرمؐ کی آمد ہی عاشورا کے دن ہوئی، ساری مذکورہ دشواریوں کے غیر اہم ہونے کی اساس پر نظر انداز کرکے اگر یہ قرار بھی دے لیا جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے وقت مکہ والوں کا ربیع الاول چل رہا تھا اور یہودیوں کا ماہ تشری، تو اس کی توجیہ دشوار نہ ہوگی، آپ ماہ محرم میں مکہ معظمہ میں عاشورا منا کر مدینہ آئے تو دیکھا کہ حقیقی عاشورا ابھی شروع نہیں ہوا ہے تو اس اسلامی اصول کی بنا پر (جو بخاری و ترمذی وغیرہ میں صراحت کے ساتھ مروی ہے کہ براہ راست وحی نہ آتی تو رسول اکرمؐ اہل کتاب کے عمل کے مطابق عمل فرماتے) یہ حکم دیا کہ عاشورے کا روزہ ۱۰ ربیع الاول سنہ ۱ھ کو یہودیوں کے یوم کپور کے موقع پر رکھا جائے، غرض یہ امکان تو ہے لیکن ہماری ناچیز رائے میں وہ قابل رد ہے، صحیح تر بات یہی ہوگی کہ مدینہ آنے کے کچھ عرصہ (چند ماہ) بعد جب یوم کپور آیا تو رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی، اس کے بعد جلدی ہی رمضان سنہ ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہو گئے اور عاشورا کا روزہ نوافل میں شامل ہو کر رہ گیا۔

خلاصہ اس ساری نظر خراشی کا منشا ایسی مثالیں دینا ہے کہ کس طرح ہمارے علم ہیئت میں بھی ہماری میراث ماضی کی ہر وقت نظر ثانی اور جانچ پڑتال ہمیں کو کرتے رہنے کی ضرورت ہے، بے سوچے سمجھے دہراتے رہنا طوطا مینا کا تو کام ہو سکتا ہے، مسلمان اہل علم کا نہیں۔

اگر اس مقالے کے ناظرین میں کوئی ہیئت داں ماہر فن بھی ہوں تو ان سے التماس ہے کہ میری غلطیوں پر متنبہ فرمائیں، علم کی خدمت بھی ہوگی اور میری شکر گذاری کا باعث بھی ہوگا۔

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری

از جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی ایم اے، فاضل دیوبند

علامہ سید انور شاہ کے سوانح اور ان کے علمی کارناموں پر سب سے پہلے وقت کے نامور وسیع النظر عالم مولانا سید محمد یوسف بنوری زید مجدہم نے قلم اٹھایا اور عربی زبان میں علامہ موصوف کی سوانح عمری نفحۃ العنبر فی ھدی الشیخ الانور کے نام سے لکھی جسے مجلس علمی ڈابھیل (سورت) نے ۱۳۵۵ھ میں شائع کیا تھا، اب یہ کمیاب ہے، اس میں موصوف نے علامہ سید انور شاہ کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے بحث کی ہے۔

دوسری کتاب جس کا نام حیات انور ہے۔ ۱۹۵۵ء میں دیوبند سے شائع ہوئی تھی، یہ اردو زبان میں علامۂ موصوف کے متعدد نامور تلامذہ کے گرانقدر مضامین کا مجموعہ ہے، جو اپنی افادیت، جامعیت اور تنوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، بایں ہمہ سید انور شاہؒ کی جامع حیثیات شخصیت پر ابھی بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے، اور اسی مقصد کے پیش نظر یہ مقالہ لکھا گیا تھا، جس کی اشاعت کی نوبت اب آرہی ہے۔

ہم نے اس مختصر مقالہ میں علامہ سید انور شاہ کے سوانح کے حصہ سے زیادہ تعرض نہیں کیا، یہ کام ان کے سعادت مند فرزندوں کے کرنے کا ہے، اور انھیں پہلی فرصت میں موصوف کی ایک جامع سوانح حیات مرتب کرنا چاہیے، اسی طرح ہم نے ان امور سے بھی زیادہ بحث نہیں کی ہے جن سے ان کے تلامذہ نے اعتناء کیا ہے، اس مختصر مقالہ میں ہم نے علامہ سید

انور شاہ کشمیری کی علمی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن پر اس سے پہلے اس نوع پر بحث نہیں ہو سکی،

محمد انور نام اور انور شاہ عرف ہے، سلسلۂ نسب یہ ہے:-

محمد انور بن محمد معظم بن عبد الکبیر بن عبد الخالق بن محمد عارف بن حیدر بن علی بن عبد اللہ ابن مسعود النزوری الکشمیری الحنفی[1]۔

ولادت اور تعلیم و تربیت

موصوف بوقت سحر بروز شنبہ ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ میں کشمیر جنت نظیر کی ایک چھوٹی سی بستی دودھوان (علاقہ لولاب) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم و تربیت انکے والد ماجد محمد معظم شاہ نے کی، پانچ برس کی عمر میں موصوف کو قرآن مجید پڑھایا، پھر فارسی شروع کرائی، ۱۲۹۹ھ میں مولوی غلام محمد رسونی پورہ سے فارسی کے ساتھ عربی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لیں اور ضلع ہزارہ کے بعض علمائے سے تین برس تک درس نظامی کی کچھ درمیانی کتابیں پڑھیں۔

۱۳۱۰ھ میں مرکز علم دیوبند پہنچے، یہاں اساتذۂ وقت مولانا غلام رسول حکیم محمد حسن وغیرہ سے درسی کتابیں جیسے حسامی، ہدایہ، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، قاضی مبارک، صدرا، تصریح، شرح چغمینی، نفیسی وغیرہ پڑھ کر ۱۳۱۴ھ میں مسندین وقت مولانا عبد العلی[2]، مولانا خلیل احمد انصاری

---

[1] ملاحظہ ہو نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین، شائع کردہ مجلس علمی ڈابھیل سورت ۱۳۵۰ھ ص ۱۴۵

[2] مولانا عبد العلی بن نصیب علی شیخ پوری میرٹھی۔ موصوف، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور فیض الحسن سہارنپوری کے تلمیذ، جید عالم اور دار العلوم دیوبند کے صف اول کے مدرسین میں سے تھے، مولانا عبد العلی نہایت سادہ، متواضع ملنسار، مہمان نواز اور خوشحال بزرگ تھے، جن ارباب کمال کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہے ان میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ سید انور شاہ کشمیری اور مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہم اللہ کا نام سر فہرست ہے

(باقی حاشیہ ص ۱۸۴ پر)

محدث سہارنپوری اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے سند فراغ حاصل کی اور ۱۳۱۱ھ میں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۳) افسوس ہے ان بزرگوں کی سوانحعمریوں میں مولانا کا نام بار بار آیا ہے، مگر کسی نے ان کے حالات سے تعرض نہیں کیا، ہمیں موصوف کے متعلق جو معلومات مل سکی ہیں وہ ہدیۂ ناظرین ہیں

مولانا عبد العلی کا آبائی وطن شیخ پور تھا، یہ میرٹھ سے چھ میل کی مسافت پر ایک چھوٹی سی بستی ہے جو ان کے بزرگوں نے بسائی تھی۔

شیخ نصیب علی کے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بڑے گہرے تعلقات تھے، حضرت نانوتوی جس زمانہ (سنہ ۱۲۹۰ھ) میں مطبع ہاشمی میرٹھ میں کتابوں کی تصحیح کرتے تھے، جمعہ کا دن موصوف کا شیخ نصیب علی کے یہاں شیخ پور ہی میں گذرتا تھا، شیخ نصیب علی جمعرات کو شام میں بہلی پر بٹھا کر موصوف کو شیخ پور لاتے اور شب و روز حجۃ الاسلام کے فیوضات ظاہری و باطنی سے کسب فیض کرتے رہتے تھے، ان ہی ایام میں میرٹھ میں مولانا عبد العلی نے موصوف سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی تھی، ان ہی نے حجۃ الاسلام سے یہ عرض کیا تھا کہ ان کی تقریر سے فن کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب پانی ہو جاتی ہے لیکن اثنائے درس میں جب موصوف اپنی تحقیقات عالیہ پیش کرتے ہیں تو ہم ان کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، لہذا تقریر کا دائرہ نفس کتاب تک محدود رہنا چاہیے، ورنہ اسباق میں ہماری حاضری سود مند نہیں، حجۃ الاسلام نے ان کی حق گوئی کو پسند کیا اور ان کی وجہ سے درس میں نفس کتاب کے درس پر اکتفا کیا، مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں:۔ "مشہور ہے اور اپنے متعدد دیوبندی اساتذہ سے یہ روایت میں نے سنی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ جیسے خداداد ذکاوت کے مالک تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ عام مصنفین خصوصاً منطق و فلسفہ کی کوئی کتاب اگر آپ کسی کو پڑھانا شروع کرتے تو وہ بیچارہ بھی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا، کہتے ہیں کہ مولوی عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ (صدر و شیخ الحدیث مدرسہ عبد الرب (حسین بخش) دہلی) شروع شروع جب مولانا کے پاس پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تو شاید صدرا یا شمس بازغہ فلسفہ کی کوئی کتاب شروع ہوئی، مولوی عبد العلی نے سبق

(باقی حاشیہ ص ۱۸۵ پر)

امام سنت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی روایت حدیث کی اجازت لی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۴) کی عبارت ختم کی اور مولانا جھنجھلاتے ہوئے فرماتے کہ بس بس ختم کرو، میاں اس مسئلہ میں قاسم کی سن لو، پھر ان کی سمجھنا، مولوی عبد العلی صاحب نے یہ انداز جو درس کا دیکھا تین چار دن بعد دبے پاؤں گھر روانہ ہو گئے، مولانا کو ان کے چلے جانے کا افسوس ہوا، شاید ان کے گھر پہنچے اور بھاگنے کی وجہ دریافت کی، مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت میں تو آپ سے کتاب پڑھنے گیا تھا، لیکن آپ تو بجائے کتاب کے قاسم کی سناتے ہیں، مولانا نے معاہدہ فرمایا کہ آئندہ ایسا نہ ہوگا، کتاب ہی پڑھاؤں گا، تب پھر واپس ہوئے۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، محبوب المطابع و جمال پرنٹنگ پریس دہلی، سنہ ۱۳۶۳ء ج ۱ ص ۲۲۲)

دار العلوم دیوبند میں ان کے درس کا آغاز غالباً ۱۲۹۵ھ سے ہوا اور یہ سلسلہ سنہ ۱۳۱۱ھ تک قائم رہا، سنہ ۱۳۱۱ھ سے موصوف مدرسہ حسین بخش دہلی سے وابستہ ہو گئے، اور تادم مرگ اسی مدرسہ میں قال اللہ اور قال الرسول کی مجلس گرم کرتے رہے۔ حکیم الامت نے ایک موقعہ پر موصوف سے اپنے تلمذ اور انکے اخلاق و عادات کا تذکرہ حسن العزیز (جلد دوم حصہ سوم مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون بجارت سنہ ۱۳۸۶ھ ص ۹۴ و ۹۵) میں اس طرح کیا ہے۔

میں نے مولانا سے مقامات حریری، سبعہ معلقہ اور کچھ نسائی پڑھی ہے، مگر برتاؤ سے مولانا کے پتہ نہیں چل سکتا کہ استاد ہیں، چنانچہ جب میں دہلی سے چلتا ہوں تو کچھ نہ کچھ ہدیہ ضرور ساتھ کر دیتے ہیں، بے لوث اور بے تعلق ہیں کسی سے کچھ مطلب نہیں، خود بھی مدرسہ میں چندہ دیتے ہیں، مقدار چندہ کی سب سے زیادہ ہوتی ہے، ۱۵۰ روپیہ یا زیادہ تک، مولانا سے جو کوئی ملنے جاتا ہے، بہت خاطر کرتے ہیں، چائے، شربت پلاتے ہیں، دیوبند میں جب تشریف رکھتے تھے تو طلبہ کی خوب تادیب فرماتے تھے،

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے سبق پڑھتے میں لیٹ کر پاؤں پیچھے کو پھیلائے، بس مولانا چلائے بدتمیز، بے ادب!

(باقی ص ۱۸۶ پر)

درس وتدریس کا مشغلہ

تحصیل علوم کے بعد موصوف نے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، چنانچہ ۱۳۱۵ھ میں جب مدرسہ امینیہ[1] کی دہلی میں بنیاد رکھی گئی تو صدر مدرس کے معزز عہدے پر موصوف ہی کا انتخاب عمل میں آیا، یہاں علامہ موصوف نے کم وبیش ساڑھے چار سال تک علوم مروجہ کا درس دیا، اور ۱۳۲۰ھ میں جب ان کے بڑے بھائی کا وطن میں اچانک انتقال ہوگیا تو ان کے پدر بزرگوار مولانا محمد معظم شاہ نے خانقاہ میں جانشینی اور بعض خاندانی امور کی انجام دہی کے لیے وطن طلب کیا، اس حادثۂ جانکاہ کی وجہ سے موصوف کو وطن جانا پڑا اور پھر والدین نے کشمیر سے باہر رہنے کی اجازت نہ دی اور یوں چار وناچار کچھ زمانہ وطن ہی میں گزرا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۵) صرف اصلاح کی وجہ سے تنبیہ فرمائی، یہ نہیں کہ اپنا ادب کرایا۔ پھر فرمایا مولوی صاحب کے پاس بیٹھنے سے ایک خاص کیفیت معلوم ہوتی ہے، ہر شخص کے یہاں بیٹھنے سے جدا فرق معلوم ہوتا ہے کہ اسے تعبیر نہیں کرسکتے ؎

خوبی ہمہ کرشمہ و ناز و خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

مولانا عبد العلی کا انتقال دہلی میں ۱۳۴۰ھ کے بعد ہوا، اور مہندیوں کے قبرستان میں خانوادۂ ولی اللّٰہی کے پائیں میں سپرد خاک کیے گئے،

مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی لکھنوی نے ۱۳۱۲ھ میں دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا تھا، اس وقت وہ موصوف سے بھی ملے تھے، انھوں نے اپنی ملاقات کا حال اپنے "روزنامچہ" دہلی اور اسکے اطراف" (شائع کردہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۵۸ء ص ۵۷ تا ۶۰) میں تفصیل سے کیا ہے۔

(حاشیہ ص ہذا) [1] مدرسہ امینیہ کے لیے ملاحظہ ہو:۔ (۱) واقعات دہلی از بشیر الدین احمد دہلوی، شمسی مشین پریس آگرہ ۱۳۳۷ھ ج ۲ ص ۳۰۰۔ (۲) مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ اسلامیہ شہر دہلی، شائع کردہ ادارۂ حفیظیہ مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی ۱۳۷۷ھ

سفر حجاز اور واپسی کے بعد مدرسہ فیض عام کا قیام

۱۳۲۳ھ میں کشمیر سے حجاز گئے، فریضۂ حج ادا کیا، مصر و شام کے نامور محدثین سے روایت حدیث کی اجازت لی، حجاز کے کتب خانوں سے استفادہ کیا، سفر حج سے واپس آکر ۱۳۲۶ھ تک والدین کے پاس وطن میں رہے، پھر وطن سے باہر رہنے پر کسی نہ کسی طرح والدین کو راضی کرلیا اور ۱۳۲۷ھ میں خواجگان قصبہ بارہ مولا میں ایک مدرسہ فیض عام کے نام سے قائم کیا، اور سال بھر یہاں درس دیا، مگر بعض لوگوں کی بدمعاملگی نے جلد ہی یہاں سے دل برداشتہ کردیا، جس کا اظہار موصوف نے اپنے ایک دیرینہ رفیق اور خواجہ تاش مولانا امین الدین بانی مدرسہ امینیہ المتوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء کے ایک مکتوب مورخہ ۲۷ جمادی الاولی میں ان الفاظ میں کیا ہے،

"میں کوئی ایک مہینہ گذرا جاتا ہے کہ مکان سے بعزم ہندوستان رخصت لیکر آگیا ہوں ہر چند کہ والدین تو راضی نہ تھے، مگر میرے الحاح پر اجازت دیدی، یہاں بارہ مولہ پہنچکر کچھ توقف سا ہوگیا، حقیر کو یہاں سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ یہاں اگر مخلوق کی بدمعاملگی کا زیادہ احساس ہوتا رہا، اتنا احساس مجھے ہندوستان میں نہیں ہوا، پھر اگر مجھے مخلوق کی طرف احتیاج مخالطت ہوتی تو لامحالہ یہ احساس کم ہوتا، مگر تجرد کے باعث یہ احساس کم نہیں۔ (ملتقطاً ومختصراً)"[1]

علامہ موصوف یہاں سے خاطر برداشتہ ہوکر ربیع الاول ۱۳۲۸ھ میں اپنے استاد شیخ زمن مولانا محمود الحسن دیوبندی کی خدمت میں پہنچے،

عجیب حسن اتفاق ہے کہ شیخ الہند نے اسی ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں دیوبند میں ایک تاریخی جلسہ کیا جس میں فضلائے دار العلوم کی دستار بندی کی گئی اور علامہ موصوف کو بھی

[1] ملاحظہ ہو مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ اسلامیہ شہر دہلی، ص ۲۶۔

یہ سعادت حاصل ہوئی۔

دار العلوم دیوبند میں تدریس کا آغاز

انہی ایام میں شیخ الہندؒ نے غالباً اس خیال سے کہ مدرسہ فیض عام میں طلبہ زیادہ نہیں اور نہ ان کی دلجمعی کا خاطر خواہ کوئی سامان ہے، ان کو [illegible] دار العلوم دیوبند میں (جہاں تشنگان علوم کا تانتا بندھا ہوا تھا، ہندوستان کے کسی صوبہ یا شہر سے طلب علم کے لیے کوئی نکلتا تھا، وہ ادھر ہی کا رخ کرتا تھا، اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ پھر دوسری طرف اس کا خیال تک نہ جاتا تھا) درس و تدریس کے فرائض انجام دینے پر مامور کردیا، انکو استاذ الکل کے حکم کے آگے یارائے سخن نہ تھا، سر تسلیم خم کردیا، اس طرح دار العلوم دیوبند میں سید انور شاہ کے درس کا آغاز ہوا، اور یہاں موصوف نے فن حدیث میں صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ جیسی امہات الکتب کا درس دیا، اور عرصۂ دراز تک کبھی اس خدمت کا معاوضہ نہیں لیا،

ازدواجی زندگی کا آغاز

علامہ موصوف اپنے غیر معمولی علمی شغف کی وجہ سے تجرد کی زندگی کو زیادہ پسند کرتے تھے، شیخ الہندؒ نے سنت رسول کی ترغیب دی اور دار العلوم کے ارباب حل وعقد نے گنگوہ کے ایک معزز خاندان میں شادی کرادی، جب اولاد ذرا بڑی ہوگئی اور اخراجات کا سلسلہ بڑھا تو ارباب حل وعقد نے معاوضہ قبول کرنے پر بہت زور دیا، ان کے اصرار پر موصوف نے نہایت قلیل بقدر کفاف مشاہرہ قبول فرمایا،

شیخ الہندؒ نے جب ۱۳۳۶ھ میں سفر حج کا ارادہ کیا تو اپنی جانشینی کے لیے اپنے تلامذہ میں سے جس جوہر قابل کا انتخاب کیا وہ سید انور شاہ ہی کی ذات ستودہ صفات تھی، جب علامہ موصوف نے بحیثیت صدر مدرس جامع ترمذی اور صحیح بخاری کا درس دیا اور یہ سلسلہ ۱۳۴۵ھ تک جاری رہا، پھر بعض انتظامی امور میں اختلاف کی وجہ سے موصوف نے دار العلوم

سے ترک تعلق کرلیا۔

دار العلوم دیوبند میں شیخ الہندؒ کے درس کا سلسلہ اگرچہ اس کے بام ترقی کا نیا پایہ تھا، لیکن علمی اعتبار سے سید انور شاہ کا زمانہ آخر المنازل تھا، اگر یہ اتفاقی واقعہ نہ پیش آجاتا تو دار العلوم کو علامہ موصوف سے استفادہ کا کچھ اور موقع مل جاتا،

علامہ موصوف ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ میں دیوبند سے ڈابھیل (سورت) تشریف لے گئے اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حدیث کا درس دینا شروع کیا، ۱۳۵۱ھ تک یہاں قال اللہ اور قال الرسول کی مجلس گرم رہی، پھر طویل علالت کے بعد دیوبند میں ۲ر صفر ۱۳۵۲ھ کو آخر شب میں جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ

حافظہ

حق تعالیٰ شانہ نے موصوف کو عجیب وغریب صفات کا حامل بنایا تھا۔ حافظہ بلا کا ملا تھا، جو بات کبھی کان میں پڑگئی وہ قید حافظہ سے پھر کبھی نہیں نکلی، اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے کیا جاسکتا ہے، فرماتے ہیں :-

"میں نے اپنے وطن کشمیر میں سنا تھا اور اس وقت میں چار برس کا تھا کہ دو آدمی اس مسئلہ میں گفتگو کر رہے تھے کہ عذاب بدن کو ہوتا ہے یا روح کو، آخر ان کی رائے یہ قرار پائی کہ عذاب دونوں کو ہوتا ہے۔ انھوں نے اس کی ایک مثال بھی دی، ایک نے کہا جسم اور روح کا ساتھ ایسا ہے جیسے ایک مرتبہ اندھے اور لولے کا ہوا تھا کہ وہ ایک باغ میں پھل توڑنے کے لیے گئے۔ اندھا پھلوں کے دیکھنے سے عاجز اور لولا ان کے توڑنے سے معذور، آخر ان دونوں نے باہم مشورہ کیا اور لولا اندھے کے کاندھے پر چڑھ بیٹھا، اندھا اس کو لیکر درختوں کی طرف چلا، لولا پھلوں کو دیکھتا اور ان کو توڑ لیتا۔

بس یہی حالت بدن کی روح کے ساتھ ہے، بدن بغیر روح کے جماد محض ہے جس کو حرکت نہیں اور روح بغیر بدن کے کچھ کرنے سے عاجز ہے، لہٰذا یہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں، جب یہ دونوں کسب میں شریک ہیں، تو اجر و ثواب میں بھی دونوں شریک ہوں گے اور سزا و عذاب میں بھی ایک دوسرے کے شریک رہیں گے، پینتیس ۳۵ برس کے بعد میں نے یہ واقعہ علامہ قرطبی کے یہاں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہما سے مروی دیکھا اور بالکل ویسا ہی جیسا کہ ان دونوں نے کہا تھا، دیکھو کیا اس قسم کی باتیں ارسطو سے بھی ممکن ہیں؟"[1]

شاہ صاحب کو فطرت کی طرف سے ایسا زبردست حافظہ عطا کیا گیا لیکن نیرنگی قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ موصوف کو قرآن مجید یاد نہ تھا، مولانا مناظر احسن گیلانی کا بیان ہے:۔

"ان (شاہ صاحب) کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا، اتنا قوی کہ لاکھوں میں شاید کسی ایک کا ہو، کم از کم اب تک اس قسم کے قوی حافظہ کے آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی، ہزارہا ہزار اشعار عربی فارسی کے زبانی یاد تھے جس کتاب پر ایک نظر پڑ گئی، گویا ان کے حافظہ کے الماری میں بند ہو جاتی تھی، جب جی چاہتا اندر ہی اندر کھول کر پڑھ لیتے، لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی کسی آیت کی ضرورت، اس قسم کے مواقع میں جیسا کہ مخدوم نے فرمایا، درس میں پیش آتی تو طلبہ کی طرف رخ کر کے دریافت فرماتے پوری آیت کیا ہے،

فقیر نے ایک دن عرض بھی کیا کہ آپ کا حافظہ تو قرآن کو شاید چند دنوں میں یاد کر سکتا تھا، پھر یہ کیا بات ہے!

جواب میں فرمایا کہ قسمت! بخت! واللہ اعلم کیا بات تھی"۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبعہ دار المامون قاہرہ ۱۳۵۷ھ ج ۴ ص ۱۱۵ [2] ملاحظہ ہو ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مطبع انتظامی حیدر آباد دکن ج ۲ ص ۱۰۳

وسعت معلومات و کثرت مطالعہ

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد آغاز عمر ہی میں سید انور شاہؒ کا دائرہ معلومات اس قدر وسعت اختیار کر چکا تھا کہ اس عہد کے نامور علما جن کی وسعت معلومات اور کثرت مطالعہ پر ان کی تالیفات شاہد عدل ہیں، اپنی تحقیقات علامہ موصوف کے حضور پیش کرتے اور موصوف ان پر بیش بہا علمی فوائد کا اضافہ فرماتے، چنانچہ اس عہد کے نامور محدث شوق نیموی نے ۱۳۱۳ھ میں جب آثار السنن کی کتاب الصلوٰۃ مکمل کر لی تو اس زمانہ کے جن ارباب نظر اور اکابر اہل علم کو یہ کتاب بھیجی گئی، ان میں ایک صغیر السن محدث علامہ سید انور شاہؒ بھی تھے، لیکن ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں اس پر بیش بہا اضافہ کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ صرف علامہ انور شاہ کی ذات ستودہ صفات تھی،

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سید انور شاہ کی تحقیقات اور اضافہ معلومات کا دائرہ محدث نیموی کے مذاق تک محدود رہا ہے، موصوف نے متون احادیث اسناد، رجال اور جرح و تعدیل سے متعلق وہی تحقیقات پیش کی ہیں جو محدث نیموی کے مذاق کے مطابق تھیں، فقہ حدیث کی بحثیں، حقائق، معارف، اسرار بلاغت اور توجیہات حدیث سے بہت ہی کم اعتنا کیا، پھر بھی یہ اضافہ اصل سے دو گنا تگنا ہو گیا ہے[1]، اور اسی افادۂ علمی کی وجہ سے موصوف نے نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۵۶) میں یہ لکھا ہے "کنت مرافقا فیہ" میں آثار السنن کی ترتیب و تدوین میں ان کا رفیق کار تھا چنانچہ محدث نیموی کے فرزند کا بیان ہے:۔

---

[1] علامہ موصوف کے اس بیش بہا اضافہ کا نام "الاتحاف للاحناف" ہے، مجلس علمی جس کا قیام ہی علامہ سید انور شاہؒ کے علوم کی نشر و اشاعت ہے، اس نے شاہ صاحبؒ کے اس نادرۂ روزگار شاہکار کے اصل نسخہ کا

(باقی ص ۱۹۲ پر)

"تو قانی کہتا ہے ناظرین باتمکین معلوم فرمائیں کہ مولانا انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ تیرہ سو بارہ ہجری میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں، جیسا کہ ان ہی کی شرح فیض الباری علی صحیح البخاری میں لکھا ہوا ہے، اور علامہ نیموی نے آثار السنن تیرہ سو چھ ہجری سے کچھ قبل ہی لکھنا شروع کیا اور تیرہ سو تیرہ ہجری میں آخر ابواب الصلوٰۃ تک تمام کر دیا، علامہ نیموی کا اوشحۃ الجید، حبل المتین، رد السکین، تبیان التحقیق المعلی وغیرہ تالیف کرنا اور ان کا معجم طبرانی وغیرہ کا نشان و پتہ بتانا کہ فلاں فلاں کتب خانہ میں ہے، اور معرفۃ السنن بیہقی میرے کتب خانہ میں ہے، یہ سب مولانا انورشاہ کشمیری کے طالب علمی کے زمانہ میں تھا، جبکہ وہ فارغ التحصیل بھی نہیں ہوئے تھے۔ لہذا مولانا انورشاہ نے جو نیل الفرقدین میں یہ لکھا ہے کہ انی کنت مرافقا فیہ اس سے مراد بعد اتمام آثار السنن قبل الطباعت ہے، مولانا شوق نیموی اپنی تحقیقات عجیبہ و فوائد غریبہ نادرۂ جدیدہ دکھانے اور معلوم کرانے کے لیے تسویدات آثار السنن قبل طباعت بذریعہ ڈاک بھیجتے ہوں گے، جس طرح کہ اور بعض علماء کے پاس آثار السنن کو بھیجا ہے، مولانا انورشاہ کشمیری کو مولانا نیموی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ان کے شاگرد حکیم مولوی محمد عیسیٰ مرحوم ساکن موضع جانا ضلع پٹنہ نے بندہ سے بیان کیا تھا کہ مولانا انورشاہ مدرسہ امینیہ دہلی میں کہتے تھے کہ ہم مولانا شوق نیموی سے جو تمہارے جوار کے ہیں، ملاقات کریں گے مگر چونکہ ۱۳۲۲ھ میں بروز جمعہ ۱۷ رمضان شریف مولانا نیموی کا وصال ہوگیا، اس وجہ سے ملاقات نہ ہوسکی، خلاصہ یہ کہ آثار السنن جس کی آخر کتاب الصلوٰۃ سنہ تیرہ سو تیرہ ہجری میں تمام ہوگئی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۱) کا مسودہ وتعدادیں فوٹو کرا کر اسکو محفوظ کر لیا ہے، اور اب علامہ موصوف کے نامور فرزند سید محمد ازہر شاہ قیصر مدیر ماہنامہ دار العلوم نے اسکی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ جلد اس کام کو بخیر و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ آمین

اور مولانا انورشاہ سنہ تیرہ سو بارہ ہجری میں کتب درسیہ مروجہ سے فارغ ہوئے، سنہ تیرہ سو بارہ ہجری کے بعد شوق نیموی ان کو بھی اپنی تحقیقات کہ جن سے کتب محدثین خالی ہیں دکھانے کیلئے اجزاء آثار السنن بذریعہ ڈاک بھیجتے ہوں گے اور علامہ کشمیری کچھ رائے و مشورہ دیتے ہوں گے واللہ اعلم۔ اس اعتبار سے من نوع موافقت کہی جاسکتی ہے، جو کہ بعد اصل تالیف و اتمام ہے نہ کہ وقت تالیف کیونکہ اس وقت تو مولانا انورشاہ محض طالب العلم تھے، فافہم۔"[1][2]

تبحر علمی ضبط و اتقان، ذکاوت و ذہانت، فہم و فراست، دقت نظر، جدت فکر، وسعت مطالعہ، کثرت معلومات، استحضار علوم اور تبحر میں اپنی نظیر آپ ہی تھے، صرف و نحو، معانی و بیان، شعر و ادب، منطق و فلسفہ، لغت، فقہ، اصول فقہ، کلام، تصوف، تاریخ، رجال، طبقات، تفسیر، حدیث اور اصول حدیث، غرض ہر فن میں مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے، اور عربی و فارسی نظم و نثر پر یکساں قادر تھے، ایسی جامعیت اور ہر فن میں ناقدانہ مہارت کی وجہ سے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی موصوف کو علوم میں ان کے اساتذہ سے بھی فائق سمجھتے تھے، وہ فرماتے تھے:-

"مولانا انورشاہ صاحب بہت بڑے متبحر عالم تھے، یہاں تک کہ ہے تو گستاخی لیکن سچی بات کو کیوں چھپاؤں، میرا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے اکثر اساتذہ سے بھی علوم میں بڑھ گئے تھے۔"[3]

حفظ حدیث علامہ سید انورشاہ بلاشبہ حفاظ حدیث میں سے تھے، حفظ حدیث کی حقیقت سمجھنے

[1] شاہ صاحب کو اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں ہندوستان کے ایک نامور وسیع النظر محدث کے اہم علمی کام میں اضافہ کی سعادت اگر حاصل ہوگئی تھی تو یہ شاہ صاحب کی وسعت نظر کی اور بھی زیادہ قوی دلیل ہے۔

[2] ملاحظہ ہو القول الحسن فی الرد علی ابکار المنن و فی تائید آثار السنن از ابن نیموی اصح المطابع اسی پریس لکھنؤ ۱۹۶۳ء ج ۱ ص ۱۹

[3] ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ (ملفوظات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی) اشرف المطابع تھانہ بھون ۱۹۴۱ء ج ۷، ص ۱۱۱

کے لیے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہو کہ محدثین کی اصطلاح میں حفظ حدیث سے مراد استحضار اور تذکر نہیں ہے یعنی احادیث کا نوک زبان پر ہونا بلکہ معرفت یعنی ملکۂ فن مراد ہے اور حقیقت میں یہی معیار حفظ ہے، اور متاخرین ائمۂ فن کے یہاں اسی کا اعتبار ہے، اسی معیار پر متاخرین حفاظ میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنے اکابر شیوخ کو جانچا اور پرکھا ہے، موصوف انباء الغمر فی انباء العمر میں حافظ زین الدین عبدالرحیم عراقی المتوفی ۸۰۶ھ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ نورالدین علی ہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ میں موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

لم نر فی هذا الفن امتن منه وعلیه تخرج غالب اهل عصره ومن اخصهم به صهره شیخنا نورالدین الهیثمی وهو الذی دربه وعلمه کیفیة التخریج والتصنیف وهو الذی یعمل له خطب کتبه وینسبها له وصار الهیثمی لشدة ممارسته اکثر استحضارا للمتون من شیخه حتی یظن من لا خبرة له انه احفظ منه ولیس کذلک لان الحفظ المعرفة[1]

ہم نے فن حدیث میں حافظ عراقی سے زیادہ متقن و پختہ نہیں دیکھا، اس زمانہ کے اکثر اہل علم نے ان ہی سے کسب کمال کیا ہے، اور ان کے تلامذہ میں سب سے ممتاز ان کے داماد ہمارے شیخ نورالدین ہیثمی ہیں، شیخ عراقی نے انھیں پڑھایا، تصنیف اور تخریج احادیث کا ڈھنگ بتایا تھا، وہ انکی کتابوں پر دیباچے لکھتے اور انکی نسبت بھی حافظ ہیثمی کی طرف کرتے تھے، ہیثمی کو فراوانی اور کثرت مشق کی وجہ سے احادیث کے متون اپنے شیخ عراقی سے زیادہ یاد ہوگئے تھے یہاں تک کہ جس کو حقیقت حال

[illegible]

[1] ملاحظہ ہو انباء الغمر بحوالہ فہرس الفہارس ومعجم المعاجم والمشیخات والمسلسلات از حافظ سید عبدالحی الکتانی المتوفی ۱۳۸۳ھ طبع فاس ۱۳۴۶ھ ج ۲ ص ۱۹۷ و ۱۹۸ و شذرات الذہب فی اخبار من ذہب از ابن العماد حنبلی مکتبۃ القدسی مصر ۱۳۵۱ھ ج ۷ ص ۵۶۔ و ذیل طبقات الحفاظ للذہبی از حافظ جلال الدین سیوطی طبع دمشق ص ۳۷۳ و البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع از قاضی محمد شوکانی طبع قاہرہ ۱۳۴۸ھ ج ۱ ص ۴۴۲

مذکورۂ بالا اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ حفظ حدیث کے لیے حافظ میں ملکۂ فن کا پایا جانا کافی ہے، استحضار و تذکر شرط نہیں ہے، چنانچہ شیخ ہیثمی صاحب مجمع الزوائد اور شیخ زین الدین عراقی صاحب الالفیہ کے بارے میں حافظ ابن حجر کا یہ لکھنا کہ ہیثمی فی الفور حدیث کی تخریج کرتے اور بتا دیتے تھے، اس بنا پر پڑھے لکھے لوگ ان کو بڑا حافظ سمجھتے تھے۔ حالانکہ نورالدین ہیثمی نے شیخ عراقی ہی سے سب کچھ سیکھا تھا، اور شیخ عراقی کو فن کا ملکہ تھا، گو فی الفور حدیثوں کی تخریج سے قاصر تھے، یہ بات علامہ سید انورشاہ کو بھی حاصل تھی، اسی لیے ہم نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے، انکی متون احادیث پر نہایت غائر نظر تھی، وہ علل اسانید سے واقف تھے، مراتب رجال کا انھیں علم تھا، وہ صحیح و سقیم کو سمجھتے تھے، اور فن جرح و تعدیل اور وفیات کے ماہر تھے، راویوں کا تشابہ رفع کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور ان فنون میں ان کو بڑا اتقان و رسوخ حاصل تھا، ان کے رسائل اور امالی آج بھی اس امر پر شاہد عدل ہیں،

فقہ و خلافیات کا حفظ علامہ سید انورشاہ حدیث ہی کے حافظ نہ تھے، بلکہ فقہ اور خلافیات کے بھی حافظ تھے، تذکرہ کی کتابوں میں بعض ارباب کمال فقہاء کے متعلق یہ فقرہ لکھا ہوا ملتا ہے کان حافظاً للفقه والخلاف یا کان حافظاً للمذاهب، کہ وہ فقہ اور خلافیات کے حافظ تھے، مذاہب ائمہ ان کو یاد تھے، یہ بات علامہ سید انورشاہ کو بھی حاصل تھی، ان کو اصول و کلیات ہی نہیں جزئیات مسائل پر بھی عبور حاصل تھا، اور اختلافی مسائل میں ہر ایک امام کا مسلک بھی برزبان تھا، ہر مسئلہ میں ائمہ اور مشائخ کے مختلف اقوال بھی ازبر تھے، ائمہ اربعہ کے اختلافات کے منشا اور مبنیٰ پر بھی ان کی نظر پوری طرح تھی، فقہ پر ان کی نظر جیسی غائر تھی اور ائمہ کے اقوال جیسے کچھ انھیں مستحضر تھے، اسکا اندازہ موصوف کے حسب ذیل بیان سے کیا جاسکتا ہے:-

لیس عندی فن اصعب من الفقه — میرے نزدیک فقہ سے مشکل ترین فن کوئی نہیں

حتی انی فی الفنون کلھا ذو رأی وتجربۃ احکم بما ارید وانتخب من اقوالھم ما ارید وافترع (اتفرع) الاراء من عندی لا احتاج الی تقلید احد ولکنی فی الفقہ مقلد بحت لیس رای سوی الروایۃ ولذا قد یصعب علی الافتاء فان الناس لا یکون عندھم الا قول واحد ویکون عندی فیہ اقوال عن الامام او عن المشائخ والتصحیح قد یختلف، ولست من اصحاب الترجیح وحینئذٍ افتی بما یقرب بمذاھب الائمۃ وآثار السلف والسنۃ[1]

جملہ فنون میں میری ایک رائے اور تجربہ ہے کہ جس کی وجہ سے میں فیصلہ کرتا ہوں اور ائمہ فن کے اقوال میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں انتخاب کرتا ہوں، میں اپنی طرف سے انکی رایوں پر تفریع کرتا ہوں اور کسی کی تقلید کا محتاج نہیں ہوں لیکن فقہ میں مقلد محض ہوں، بجز روایت امام کے کوئی رائے نہیں رکھتا، اسی وجہ سے مجھے فتوی دینے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ لوگوں کے سامنے ایک قول کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور میرے پیش نظر امام یا مشائخ کے متعدد قول ہوتے ہیں، پھر کبھی تصحیح میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور میں اصحاب ترجیح میں سے نہیں ہوں میں ایسے وقت میں مذاہب ائمہ و آثار سلف اور سنت سے جو قوی معلوم ہوتا ہے اسی پر فتوی دیتا ہوں۔

طبقات فقہاء پر نظر | طبقات فقہاء پر بھی انکی نظر غیر معمولی وسیع تھی، اور اس فن میں بصیرت کا یہ حال تھا کہ کبار فقہاء کے متعلق ان کی اپنی خاص آراء تھیں کہ کون کس درجہ کا فقیہ ہے، اور نقل میں انکی کیا حیثیت ہے، کون فقیہ النفس ہے اور کون نہیں، چنانچہ امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی المتوفی ۳۲۱ھ کے متعلق فرماتے ہیں:۔

[1] ملاحظہ ہو فیض الباری ج ۴ ص ۱۹۷

"امام طحاوی، مذہب امام اعظم ہی کے سب سے زیادہ عالم نہیں بلکہ دیگر مذاہب ائمہ کے بھی سب سے زیادہ واقف تھے، وہ امام شافعی کے بیک واسطہ شاگرد تھے اور امام مالک سے بدو واسطہ تلمذ رکھتے تھے، اور امام اعظم ابوحنیفہ سے ان کو بسہ واسطہ تلمذ کا فخر حاصل ہے، کتاب شرح معانی الآثار کے باب الحج میں موصوف نے تصریح کی ہے کہ امام احمد سے بھی ان کو بیک واسطہ اجازت حاصل ہے، طحاوی مجتہد و مجدد ہیں، جیسا کہ ابن الاثیر جزری نے لکھا ہے کہ وہ مجدد تھے،

میں کہتا ہوں کہ شرح حدیث ان کا تجدیدی کارنامہ ہے، وہ شرح حدیث میں مجمل حدیث کو بتاتے ہیں، حدیث کے غوامض و دقائق بیان کرتے ہیں بحث و تحقیق کرتے ہیں اعتراضات کے جوابات دیتے ہیں اور وہ اس انوکھے طریقہ کے امام ہیں کیونکہ متقدمین صرف احادیث کو بطور سند و متن روایت کرنے پر اکتفا کرتے تھے،[1] اور فیض الباری میں ہے کہ مالکیہ نے ان کی تصانیف سے حنفیہ کی بنسبت زیادہ اعتناء کیا ہے[2]"۔

علامہ موصوف ملک العلماء ابوبکر بن مسعود کاشانی المتوفی ۵۸۷ھ کی کتاب البدائع والصنائع فی ترتیب الشرائع کی بہت تعریف کرتے تھے، اور اس کے متعلق فرماتے تھے:۔

عراقی فقہاء حنفیہ کی تالیفات میں خراسانی فقہاء حنفیہ کی تصانیف کی بنسبت زیادہ رسوخ و اتقان پایا جاتا ہے لیکن کتاب البدائع باوجودیکہ اس کا مؤلف ملک العلماء ابوبکر کاشانی، خراسانی ہے مگر اس کی یہ کتاب اتقان و تثبت میں فقہائے عراق کی مثل ہے بلکہ حسن ترتیب میں ہمارے فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کی تمام کتابوں سے فائق ہے، یہ نہایت نادر المثال کتاب ہے، اگر کوئی عالم ژرف نگاہی اور دقت نظر سے اس کا مطالعہ کرے تو وہ

[1] ملاحظہ ہو العرف الشذی علی جامع الترمذی، مکتبہ رحیمیہ سہارنپور ص ۳۶ و معارف السنن از مولانا محمد یوسف بنوری طبع کراچی ۱۳۸۳ھ ج ۱ ص ۴۲، نیز فیض الباری ج ۳ ص ۳۵۱ و ج ۱ ص ۳۰،۳ [2] ایضاً فیض الباری ج ۳ ص ۶۹

فقیہ النفس ہیں کہ، یہ کتاب مدرس اور مولف کے لیے مغنی کی بہ نسبت زیادہ مفید ہے[۱]"۔

مولف کے بارے میں ایسا بصیرت افروز تبصرہ فقہاء میں سے کسی اور فقیہ سے منقول نہیں، اسی طرح علامہ موصوف کی فقیہ زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم حنفی المتوفی ۹۷۰ھ، محمد امین بن عمر عابدین دمشقی حنفی المتوفی ۱۲۵۲ھ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے متعلق جو رائے ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:-

ان ابن نجیم افقہ عندی من الشامی	میرے نزدیک بلاشبہ ابن نجیم علامہ شامی
لما اری فیہ ان امارات التفقہ تلوح	سے زیادہ فقیہ ہیں، کیونکہ مجھے ان میں تفقہ
والشامی معاصر للشاہ عبدالعزیز	کے آثار بہت روشن نظر آتے ہیں، فقیہ شامی
رحمہ اللہ تعالیٰ وھو افقہ ایضاً	شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کے معاصر ہیں
عندی من الشامی رحمہ اللہ تعالیٰ	اور میرے خیال میں شاہ صاحب شامی سے زیادہ
وکذا الشیخ مشائخنا رشید احمد	فقیہ ہیں اور اسی طرح ہمارے شیخ الشیوخ
الگنگوھی قدس سرہ افقہ عندی	رشید احمد گنگوہی قدس سرہ میرے نزدیک
من الشامی[۲]	شامی سے بڑھکر فقیہ ہیں

بعض مشاہیر ائمۂ فن کے متعلق رائے

اسی طرح دیگر ائمۂ فن اور اکابر علماء کے متعلق بھی ان کی خاص رائیں ہیں، چنانچہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۰ھ، حافظ ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ، شیخ تقی الدین بن دقیق العید المتوفی ۷۰۲ھ، حافظ ابن عبدالبر المتوفی ۴۶۳ھ، جمال الدین زیلعی المتوفی ۷۶۲ھ اور حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کے متعلق علامۂ موصوف فرماتے ہیں:

[۱] ملاحظہ ہو نفحۃ العنبر من ہدی الشیخ الانور از مولانا محمد یوسف بنوری مجلس علمی ڈابھیل (سورت) ۱۳۵۵ھ ص ۸۵

[۲] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبعہ مجازی، قاہرہ ج ۲ ص ۱۴۱ ج ۲ و ج ۱ ص ۱۲۰

"میرے نزدیک شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ اس امت کی عظیم ترین شخصیتوں سے ہیں، وہ حقائق کی تہ تک پہنچے ہیں اور اس فن میں وہ سب سے آگے ہیں اور اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں حافظ ابن تیمیہ بلاشبہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک بحر بیکراں ہے، لیکن چند اصولی اور فروعی مسائل میں وہ جمہور امت سے منفرد ہیں، حالانکہ حق پر جمہور علماء ہیں ابن تیمیہ کشف و کرامات کے بھی منکر ہیں البتہ مصداق کشف کے قائل ہیں اور وہ اسکو فراست مومن سے تعبیر کرتے ہیں...... انکی طبیعت میں تیزی بہت ہے وہ اپنی تحقیق کو وحی آسمانی سمجھتے ہیں، اگرچہ وہ حقیقت کے خلاف کیوں نہ ہوں اور مخالف کی وہ پرواہ نہیں کرتے، اگرچہ وہ حق پر ہی کیوں نہ ہوں، یہ اہل علم کے وہ طبقات و مراتب ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا ہے، ان میں سے بعض میں بڑا اعتدال ہے اور وہ نہایت انصاف پسند ہیں جیسے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید ابن عبدالبر اور زیلعی، بعض میں اعتدال نہیں ہوتا، ان کی طبیعت میں شدت و حدت ہوتی ہے، جیسے ابن تیمیہ ہیں، بعض میں شدت تعصب کے ساتھ بیدار مغزی بلا کی ہوتی ہے، جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں[۱]"۔

مصطلحات فن پر اضافے

علامہ سید انور شاہ نے مصطلحات فن پر بھی اضافے کئے ہیں، اصول فقہ جو ایک نہایت دقیق اور مشکل فن ہے اور ہمیشہ سے دقیقہ سنج اور دقیق النظر علماء کی بحث و نظر کی آماجگاہ بنا رہا ہے، اس اہم فن کی بعض مصطلحات پر علامہ موصوف کو اضافہ کا فخر حاصل ہے۔

ائمۂ فن نے متواتر کی تعریف کی ہے، اور تواتر اسناد کو بیان کیا ہے، لیکن نہ اس کے اقسام سے پورا اعتناء کیا اور نہ انھیں منضبط کیا اور نہ اس کے اقسام کو جداگانہ ناموں سے

[۱] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبعۃ مجازی، قاہرہ ج ۲ ص ۱۶۴

ممتاز و متعین کیا، تواتر کی بحث کلام اور اصول دونوں جگہ ہے، لیکن اصولیین اور متکلمین دونوں ہی اس باب میں خاموش ہیں، اسلامی دنیا میں علامہ سید انور شاہ نے پہلی مرتبہ تواتر کے اقسام سے اعتنا کیا، اور اس کو اقسام اربعہ میں منحصر کیا، اس کی ہر قسم کو ایک خاص اور مستقل نام سے نامزد کیا، تواتر کے وہ اقسام اربعہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) تواتر الاسناد (۲) تواتر الطبقہ (۳) تواتر العمل والتوارث (۴) تواتر القدر المشترک۔

ان اقسام اربعہ کا تذکرہ علامہ موصوف نے اپنے رسالہ نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۲۲) میں اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے (مقدمہ) فتح الملہم بشرح صحیح مسلم (ص ۵) میں ان کی خوب وضاحت کی ہے، اور اردو میں اس کی تشریح فیصلہ مقدمہ بہاولپور طبع لاہور ۱۹۳۵ء میں بھی مذکور ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے اس تقسیم کی داد ان الفاظ میں دی ہے:۔

وهذه الاقسام الاربعة للتواتر	یہ تواتر کی چار قسمیں ہیں، اگرچہ اس کی
وان كانت جزئياتها منتشرة	جزئیات اصولیین کی کتابوں میں منتشر
فى كتبهم لكنهم لم يكونوا	طور پر پائی جاتی ہیں، لیکن وہ تقسیم کے موقع
يذكرونها عند التقسيم	پر ان کا تذکرہ نہیں کرتے تھے، سب سے پہلے
واول من ربع القسمة وسمى	جس اصولی نے تواتر کو چار قسموں میں
كل قسم باسمه فيما نعلم الشيخ	منقسم کیا اور ہر ایک قسم کو ایک مخصوص
العلامة الانور اطال الله بقاءه	نام سے ممتاز و متعین کیا وہ ہمارے علم میں
وهو تقسيم حسن[1]	شیخ علامہ انور شاہ اطال اللہ بقاءہ ہیں۔

۱؎ ملاحظہ ہو مقدمہ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم، مدینہ برقی پریس بجنور ۱۳۵۲ھ ص ۶

علامہ سید انور شاہ کی اس تقسیم کی خوبی، ندرت اور جامعیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جن ماہران فن نے مصطلحات فنون پر مستقل اور جداگانہ کتابیں لکھی ہیں اور درسی کتابوں کے حواشی سے بھی مفید مفید باتیں سمیٹ لی ہیں اور گوناگوں معلومات جمع کرنے میں خوب داد تحقیق دی ہے، ان کے یہاں بھی تواتر کے اقسام تواتر لفظی و معنوی سے زیادہ نہیں ہیں۔[1]

اسی طرح علامہ موصوف نے حدیث صحیح کی بھی ایک جداگانہ تقسیم کی ہے، اور اس کو بھی اقسام اربعہ میں منحصر کیا ہے[2]، اسی طرح طبقات کتب حدیث میں بھی علامہ موصوف کی رائے جمہور علماء سے کچھ مختلف ہی ہے[3]۔ (باقی)

۱؎ ملاحظہ ہو کتاب التعریفات از سید شریف علی جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ طبع مصر ۱۳۵۷ھ ص ۱۷۵، کتاب الکلیات از ابو البقاء حسینی کفوی المتوفی ۱۰۹۵ھ طبع بولاق مصر ۱۲۵۳ھ ص ۱۲۷، دستور العلماء از عبد النبی احمد نگری طبع دکن ج ۳ ص ۸، کشاف اصطلاحات الفنون از محمد علی تھانوی طبع کلکتہ ۱۸۶۲ء ص ۱۴۷۰ تا ۱۴۷۳

۲؎ ملاحظہ ہو (مقدمہ) فیض الباری ج ۱ ص ۵۸ ۳؎ ایضاً ج ۱ ص ۵۷۔

اسلامی ہندوستان کی علمی خودداری

الدرۃ الثمینۃ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی

اور

شاہجہاں اور نواب سعد اللہ خاں

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری، ایم اے، ایل ایل بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش

اعتذار:۔ اس عنوان سے معارف (اکتوبر ۱۹۲۲ء) میں جناب حافظ احمد علی خاں شوق ناظر کتب خانہ ریاست رامپور نے رضا لائبریری کے مخطوطہ "الدرۃ الثمینہ" کو متعارف کرایا تھا، اس مقالہ کی اشاعت کو پینتالیس ۴۵ سال ہو رہے ہیں، اس عرصہ میں نئے مصادر و مراجع منظر عام پر آچکے ہیں جن میں سب سے اہم امام الدین الریاضی (مصنف "التصریح فی الھیئۃ") کا تذکرہ "باغستان" ہے۔

یوں بھی پینتالیس ۴۵ سال کا عرصہ اچھا خاصہ طویل ہوتا ہے، بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ ماضی کی شاندار روایتیں ہمارے لیے بڑی تیزی سے بھولی بسری داستانیں بنتی جا رہی ہیں، اس لیے مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے اکتشافات کی جدید معلومات کے ساتھ تجدید کیجائے۔

گاہ گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

فاضل مقالہ نگار نے فرمایا تھا:۔

"کتب خانہ ریاست رامپور میں مجموعہ نمبر ۱۱۴ فن کلام عربی میں یہ مختصر مجلد رسالہ ہے، تقطیع

کتاب ۱۰×۶ ½ انچ۔ مسطر ۳ ½ انچ، تعداد سطر فی ص ۱۵۔ خط مولویانہ شکست آمیز صفحات ۲۰ ہیں۔ ۱۰۵۰ھ کا لکھا ہوا ہے (۱) اس رسالہ کو شاہجہاں بادشاہ کے نام پر معنون کیا گیا ہے، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اس کے مصنف ہیں۔ آغاز رسالہ یہ ہے: "اللّٰھم باسمک ابتدئ و بنورِ قدسک اھتدی"۔ رسالہ میں علم باری تعالیٰ اور مبحث قدم عالم کو نہایت خوبی سے لکھا ہے (۲) ملا صاحب کا انتقال ۱۰۶۸ھ یا ۱۰۶۶ھ میں ہوا ہے۔ اس لیے یہ رسالہ ان کی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے (۳) ملا صاحب کے کمالات اور فضائل سے مدارس عربیہ کا ہر طالب علم واقف ہے (۴) ان کی شہرت آج نہیں بلکہ ان کی زندگی ہی میں ہندوستان سے نکل کر عرب و روم میں پہنچ چکی تھی، چنانچہ آجکل ان کی جس قدر کتابیں ہندوستان میں نہیں چھپی ہیں، اس سے زیادہ ٹرکی اور قسطنطنیہ میں چھپی ہیں، ہندوستان سے ٹرکی ان کتابوں کے پہنچنے کی صورت یہ معلوم ہوئی کہ قدیم زمانہ میں جہاں سلاطین باہم اور تحفہ تحائف اپنے ملک کی مصنوعات کا بھیجا کرتے تھے، وہاں اپنے دربار کے شعرا کی غزلیں، قصائد، دواوین اور علما و فضلا کی تصنیفات و تالیفات بھی بھیجا کرتے تھے (۵) چنانچہ شاہ جہاں اور سلطان محمد خاں سلطان روم کے درمیان اس قسم کے تعلقات قائم تھے، اور اس طرح شاہی تحائف کے ضمن میں ہندوستان کے اس مائۂ ناز حکیم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تصنیفات ٹرکی پہنچی ہیں، (۶) آج اس سلسلہ میں ہم ملا صاحب کے رسالہ الدرۃ الثمینہ کا تذکرہ کرتے ہیں، عراق میں جان نثار خاں شاہجہاں کی طرف سے کسی خدمت پر مامور تھا (۷) محمد فاروق مشرف اور محب علی واقعہ نویس اس کے ہمراہ تھے، سلاطین صفویہ کے خاندان کا ایک رکن رکین خلیفہ سلطان ایران سے نکل کر عراق میں آباد ہو گیا تھا (۸) پھر وہ ہندوستان چلا آیا تھا۔ (۹) شاہجہانی تاریخوں میں اس کا ذکر متعدد مقامات میں ہے (۱۰) یہ لائق اور صاحب علم

امیر تھا اور "وزیر دانشور عراق" کے نام سے مشہور تھا (۱۱) شاہجہانی سفراء (۱۲) جب عراق گئے تو خلیفہ سلطان سے بھی ملے۔ ان شاہجہانی سفراء کو بھی اپنی جگہ دعویٰ فضل و کمال تھا اور اس کو قائم رکھنا گویا ہندوستان اور سلطنت ہند کی عزت وہ سمجھتے تھے، (۱۳) وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے (تہافت الفلاسفہ میں) مسئلہ قدم عالم اور نفی علم واجب تعالیٰ کے سبب سے (۱۴) شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے، جان نثار خاں نے شاہجہاں کو اطلاع کی (۱۵) بادشاہ نے اپنے وزیر سعد اللہ خاں کو حکم دیا کہ ملا عبد الحکیم صاحب کو لکھو کہ اس کے متعلق دس پندرہ دن میں ایک رسالہ لکھکر حاضر کریں کہ عراق کو بھیجا جائے۔ خدا جانے سلاطین کو اس مسئلہ سے کیا دلچسپی تھی (۱۶) چنانچہ اسی کے پس وپیش زمانہ میں امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ اور ابن رشد نے جو اس کا جواب تہافت تہافت الفلاسفہ کے نام سے لکھا ہے، سلطان محمد خاں دوم نے اپنے دربار کے بڑے فلسفی موحی فوادوی (۱۸) سے اس پر محاکمہ لکھوایا ہے جو کتاب الذخیرہ کے نام سے چھپ گئی ہے، بہرحال یہ مسئلہ بہت مہتم بالشان ہے، سینکڑوں کتابیں اس مبحث پر لکھی گئی ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ شاہان مغلیہ کے الفاظ کو احکام میں بعینہ نقل کیا جاتا تھا، شاہجہاں کی علمی قابلیت کا یہ نمونہ ہے کہ اس نے اس مسئلہ میں جن امور پر رسالہ لکھوانا چاہا ہے، اس کو چند جملوں میں ادا کر دیا، سعد اللہ خاں کے خط کو پڑھیے، کہتا ہے کہ کلمات حکماء، تاویلات علماء، وجہ تکفیر اہل اسلام، اقوال ملت، مباحثات، مناظرات شکوک و شبہات، ازالۂ اعتراضات، سوالات و جوابات غایت تدقیق و نہایت تحقیق سے لکھے جائیں۔ در ہر باب و اساس سخن میں اصل کلام پر گفتگو ہو اور ہر جواب میں براہین ہوں احاطہ مسائل متعلقہ بمطلب علم حصولی و حضوری کے مسائل متعلقہ کے بیان میں پورا احاطہ

کیا جائے اور نیز اس مسئلے کو صاف کیا جائے کہ علم عین عالم ہے یا عین معلوم یا غیر۔ اور اس کا تعلق جزئیات سے بوجہ کلی ہے یا بوجہ جزئی وغیرہ۔

سعد اللہ خاں کی علمی استعداد تو مشہور رہی ہے، لیکن شاہجہاں کی علمی فضیلت بھی اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ کم نہ تھی، ظاہر ہے کہ جو شخص کسی علم و فن سے واقف نہ ہو وہ کیا اسکو سمجھ سکتا ہے، اگر شاہجہاں کی تاریخ کے ساتھ اسکے کمالات علمی کی بھی تلاش کیجائے تو کیا اچھا ہو۔

سعد اللہ خاں وزیر نے شاہجہاں کے حکم سے اس باب میں ملا صاحب کو جو خط لکھا ہے وہ بھی اس رسالہ کے ساتھ شامل ہے اور اس کی نقل حسب ذیل ہے"۔

اس کے بعد فاضل مقالہ نگار نے اُس خط کو نقل کیا ہے۔ ہم اسے بعد میں دوسرے نسخے کے ساتھ موازنہ کرکے نقل کریں گے، یہاں صرف محلات نظریہ کی نشاندہی کیجاتی ہے:

محلات نظریہ

(۱) ۱۰۵۷ھ رسالہ کا سال تصنیف ہے، مخطوطہ کا سال کتابت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے آخر میں مرقوم ہے

"ولیکن هذا آخر ما اردنا ایراده فی هذه الرسالة الخاقانیة حامداً لله تعالیٰ ومصلیاً علی نبیه وآله شارعاً فی تحریره صحوة یوم الجمعة خامس شهر ربیع الثانی متمماً فی آخر یوم الجمعة ثانی عشر منه من ۱۰۵۷ھ"۔

(۲) مقالہ نویس نے ایک مبحث کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہے مسئلہ حشر اجساد۔ اصل مناظرہ میں تین مسئلے پیش نظر تھے: عالم کا حدوث وقدم، حشر اجساد کا اقرار وانکار اور علم باری تعالیٰ بجزئیات مادیہ کی تائید یا تردید۔ ان میں سے رسالہ میں پہلے دو مسئلوں سے یونہی سا تعرض کیا گیا ہے۔ صرف تیسرے مسئلے سے بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۳) ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ۱۰۵۷ھ رسالہ کا سال تصنیف ہے (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

ذکر مخطوط کا سنہ کتابت،

(۴) لیکن اس زمانہ میں جبکہ قدیم اور جدید کے درمیان بعد المشرقین پیدا ہو چکا ہے، اس عبقری وقت کا تعارف ضروری ہے۔

(۵) ایسا نہیں ہے، بلکہ علم و حکمت کی نشر و اشاعت شاہانِ وقت کے "ارسال ہدایا و تحف" سے بے نیاز تھی۔

(۶) اور ترکی کے علماء کی تصانیف مثلاً "خیالی" کس طرح ہندوستان میں آکر داخل درس ہوئیں؟

(۷) ۱۰۵۶ھ میں سفیر بنا کر ایران بھیجا گیا تھا (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

(۸) عراق سے آجکل کا عراق مراد نہیں ہے، بلکہ عراق عجم جو مغربی ایران کا نام تھا۔

(۹) خلیفہ سلطان خود نہیں آیا، بلکہ اس کے خاندان کے کچھ افراد آئے تھے۔

(۱۰) خلیفہ سلطان کا نہیں، بلکہ اس کی اولاد کا ذکر ہے۔

(۱۱) خلیفہ سلطان اعتماد الدولہ اس کا لقب تھا۔

(۱۲) "شاہجہانی سفراء" نہیں بلکہ شاہجہاں کا سفیر (جان نثار خاں) اور سفارت خانہ کا عملہ۔

(۱۳) اس ادعائے ہمہ دانی کا تو سلطنت کی عزت سے کوئی تعلق نہیں تھا، یہ محض سفارت خانہ کے عملہ کی بو الفضولی ہی تھی، البتہ جب ان بو الفضولوں کو اس مناظرے میں منہ کی کھانا پڑی تو ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کی بحالی کا سوال پیدا ہوا اور اسی لیے یہ رسالہ لکھوایا گیا۔

(۱۴) تیسرا مسئلہ (حشر جسمانی) پھر بیان ہونے سے رہ گیا ہے،

(۱۵) اس مکتوب کا جو دوسرا نسخہ تذکرہ باغستان میں منقول ہے، اس میں لکھا ہے کہ مناظرہ ہوا جس میں ہندوستانی سفارت خانہ کے عملہ کو شکست ہوئی، اس پر شاہجہاں کو اطلاع دی گئی۔

(۱۶) "سلاطین کو اس مسئلہ سے دلچسپی" کا سوال نہیں تھا، بلکہ ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کی بحالی کا معاملہ تھا،

(۱۷) بس و پیش زمانہ میں نہیں، بلکہ پورے دو سو سال پہلے، کیونکہ یہ گیارہویں صدی کے وسط میں لکھا گیا تھا، اور سلطان محمد فاتح نے "تہافت الفلاسفہ" امام غزالی اور "تہافت التہافت" ابن رشد پر محاکمہ نویں صدی ہجری کے وسط میں کرایا تھا۔

(۱۸) اس لفظ "موحی فواردی" کو نہیں پڑھا جا سکا۔ ممکن ہے "مولیٰ خواجہ زادہ" ہو مگر کتاب "الذخیرہ" ان کی تصنیف نہیں ہے۔ یا "مولیٰ علاء الدین طوسی" ہو مگر اس تصحیف سے اقرب نہیں ہے۔

(۱۹) یہ فاضل مقالہ نگار کی قیاس آرائی ہے کہ "شاہان مغلیہ کے الفاظ کو احکام میں بعینہ نقل کیا جاتا تھا"۔ ورنہ وزیر یا دفتر کا سربراہ شاہی مراسلات کا مسودہ تیار کرتا تھا اور بادشاہ اس پر دستخط کرتا تھا یا مہر لگاتا تھا۔ لہذا "چند جملے" اور مسائل مجوزہ کی تفصیل سعد اللہ خاں علامی کی کاوش ذہن کا نتیجہ ہیں۔

اس خط کا ایک دوسرا نسخہ "تذکرہ" "باغستان" میں محفوظ ہے جو میرے خیال میں زیادہ قابل اعتماد ہے، بہرحال دونوں نسخوں کی مدد سے اس خط کی نقل ذیل میں پیش کیجا رہی ہے۔

علامی سعد اللہ خاں کا مکتوب

"افادت پناہ افاضت دستگاہ جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول وحید العصر فرید الدہر با دراک نشأتین و احراز دارین کامیاب باشند۔ حسب الحکم اشرف می نویسد کہ چوں از افواہ و وقائع ایران بمسامع مجامع رسید کہ افادت پناہ افاضت و دستگاہ خلیفہ سلطان وزیر و دانشور عراق کہ اعلم العلمائے آں دیار است از محمد فاروق مشرف و مجیب علی واقعہ نویس کہ با بارت مآب جان نثار خاں سفیر متعین اند، بس از دعوائے ایماں بفضل و کمال

پرسید کہ امام غزالی در مسئلہ قدم عالم ونفی علم واجب (تعالیٰ شانہ کما یقول الظالمون فی حق انفسہم والجاہلون باللہ جہلاً وکبیرا) بجزئیات مادیہ ونفی حشر اجساد تکفیر ابونصر فارابی وشیخ ابو علی سینا نمودہ۔ وجمعے تاویل کلام حکما کردہ اند۔ ایں مراتب را تقریر باید کرد۔ مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند واز مسلک معقولیت دور افتادند۔ لہذا اکبرین مریدان حکم شد کہ بآں فضائل وکمالات دستگاہ سطرے چند برنگارد وفرگزارد کہ آں افادت وافاضت مرتبہ را دریں مسائل مختصرے جامع وموجزے مفید کہ مستجمع کلمات حکما وتاویلات علماء ووجہ تکفیر اسلامیین واقوال ملیین ومباحثات ومناظرات وشکوک وشبہات وادلات وازاحات واسولہ واجوبہ وغایت تدقیقات ونہایت تحقیقات واصل کلام در ہر باب واساس سخن در ہر جواب وانچہ بداں ظفر یافتہ باشند وبرہان بداں فائز شدہ باشند۔ واحاطہ مسائل متعلقہ بمطلب علم از حضوری وحصولی بودن وعلم عین عالم وعین معلوم یا غیر آں وتعلق آں بجزئیات بروجہ کلی است یا بروجہ جزئی وتحریر آنکہ کلیت وجزئیت مفہوم تابع مدرک یا تابع مدرک است ونسبت واجب جزئی ہست یا نہ۔ وبیان آنکہ ادراک تعقلی است یا احساسی۔ وشمول علم بغیبات ومشخصات از زمان وغیر آں۔ وبقائے علم بانغیر معلوم وتبدل زماں۔ وحضور زماں بجمیع اجزائہ من ازل الآزال الی ابد الآباد ودیگر غیر آں وخبر آں باشد، نوشتہ در حضرت خلافت در عرض دہ پانزدہ روز باید فرستاد کہ بایران فرستادہ شود۔ وآں چناں باید بود کہ قابل فرستادن ولائق اضافت آں فضائل دستگاہ بود وبروزگار ازاں آثار گونید ودر تاریخ تاجہا نوشتہ آید۔"

الدرۃ الثمینۃ کا مصنف، نام ونسب[1]

الدرۃ الثمینۃ کے مصنف علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی جو نہ صرف

[1] ملاحظہ ہو محلات نظریہ میں سے نمبر (۴)

اپنے وقت کے بلکہ ہندوستان کے ایک عظیم المرتبہ فاضل تھے، پدر بزرگوار کا نام شمس الدین تھا جو غالباً اپنے دیگر ابناء وطن کی طرح کشمیر سے سیالکوٹ میں آ بسے تھے،

تعلیم واساتذہ

ابتدائی تعلیم کی تفصیلات تاریخ نے محفوظ نہیں رکھیں لیکن اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کشمیر کے ایک جلیل القدر استاد ملا کمال الدین سے کی، میر غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:

"در عنفوان سن تمیز دامن ہمت بطلب علم برزد وبیشتر نزد ملا کمال الدین کشمیری کہ متوطن بلدۂ سیالکوٹ وبلند پرواز عالم ملکوت بود تلمذ نمود"۔ (مآثر الکرام، ص ۲۰۴)

ان سے پہلے عبدالحمید نے بادشاہ نامہ میں لکھا تھا:

"اکثر علوم نزد ملا کمال کشمیری کہ در سیالکوٹ مسکن داشت وبانوار باطنی روشن، تلمذ نمودہ است"۔

ملا کمال الدین اپنے بھائی مولانا جمال الدین کی طرح کشمیر کے ایک صاحب دل شیخ اور عالم بابا فتح اللہ کے داماد اور شاگرد تھے، چنانچہ محمد اعظم کشمیری نے "واقعات کشمیر" میں لکھا ہے:

"مطلع الانوار لایزال اخوند ملا کمال برادر مولانا جمال است۔ جلال دقائق وکشاف حقائق بود۔ نسبت علمی غالب داشت چنانچہ برادر عالی قدرش را جہت تقوی راجح بود ...... در سیالکوٹ ولاہور مسند افادہ علوم بیارا است، وعالمے از فیض خدمتش بصاحب کمالی برخاست ...... علمائے بسیار مثل مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی از خدمتش مستفید گردیدند"

اسی زمانہ میں علامہ عبدالحکیم کے تعلقات حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ استوار ہونا شروع ہوئے اور علامہ عبدالحکیم ہی نے حضرت مجدد صاحب کی قوت مناظرہ سے متاثر ہوکر انھیں "امام العلماء" کے نام سے موسوم کیا، لیکن بعد میں دونوں دوستوں نے مختلف راہیں اختیار کیں: علامہ نے مسند درس وافادہ کو زینت بخشی اور مجدد صاحب نے رشد وہدایت اور تجدید واصلاح کے فرائض کو

الدرۃ الثمینۃ

انجام دیا۔

بہرحال باکمال استاد کے فیض تلمذ کا نتیجہ تھا کہ سیالکوٹ کا یہ لائق سپوت عرصۂ قلیل میں جملہ علوم و فنون کے اندر دستگاہ عالی حاصل کرکے خود تشنگان علم و حکمت کو فیض پہنچانے لگا، آزاد بلگرامی نے ان کے تلمذ کے بعد لکھا ہے:۔

"در فرصت کمی ہلال استعداد وش بدر کامل گشت ...... عرصۂ جہاں را بلوامع فیض منور ساخت"

درس و تدریس کا آغاز شروع میں اپنے بیشمار معاصرین کی طرح علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی دربار سلطنت سے دور اور شاہی جود و سخا سے بے نیاز ہوکر خود کو نشر علوم کے لیے وقف کردیا، یہ جہانگیر کا زمانہ تھا، چنانچہ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:

"در عہد جہانگیری بہ معاش ضروری ساختہ در وطن مالوف بسر می برد"

اسی طرح عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں لکھا تھا:

"در ایام سعادت فرجام حضرت جنت مکانی بضروریات معیشت در ساختہ عزلت گزیں بود"

مگر اس عزلت گزینی کے باوجود ان کے فضل و کمال اور جلالت علمی کا شہرہ دربار تک پہنچے بغیر نہ رہا، چنانچہ معتمد خاں نے "اقبال نامہ جہانگیری" میں منتخب روزگار فضلاے عہد کی جو مختصر فہرست دی ہے اس میں علامہ عبدالحکیم کا نام بھی ہے، حالانکہ ان کے سوا ان کے معاصرین و متاخرین میں سے کسی کا بھی مذکور نہیں ہے، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ شروع ہی سے علمی دنیا میں منفرد اور نمایاں تھے۔

عہد شاہجہانی اور دربار تک رسائی ۱۰۳۷ھ میں جہانگیر کے انتقال کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا، اس نے علم و ادب کی سرپرستی کے نئے دور کا آغاز کیا، میر غلام علی آزاد نے لکھا ہے:

"چوں نوبت درانی ہندوستان بہ صاحب قران شاہجہاں انار اللہ برہانہ رسید ......

معارف نمبر ۳ جلد ۱۰۰

طائفہ علما و شعرا را رواجے دیگر پیدا شد" (مآثر الکرام صفحہ ۲۰۴-۲۰۵)

علامہ عبدالحکیم بھی جو "نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا" پر عامل تھے، قدرشناس بادشاہ کی زہینت سے محروم نہ رہ سکے، اسی زمانہ میں انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا جو اپنی نوعیت کا منفرد علمی کارنامہ تھا، اس کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا، اس کی جوہر شناس نگاہ نے امید سے زیادہ قدر افزائی کی، اس سے علامہ کے حوصلے بڑھ گئے اور اس کی تکمیل میں لگ گئے۔ (اس کی تفصیل انھوں نے اپنے "حاشیہ تفسیر بیضاوی" کے دیباچہ میں دی ہے)۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سی تصانیف بادشاہ کے نام پر معنون کیں اور اس سلسلے میں بار بار دربار میں بلائے گئے اور شاہی انعامات سے نوازے گئے، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:۔

"ملا دریں عہد بارہا خود را بہ صدگاہ خلافت رسانید، ہرگاہ وارد حضور می گردید برعایت نقود نامحدود مخصوص می گشت۔ دوبار بزر سنجیدہ شد و مبالغ ہم سنگ ہم گرفت و چند قریہ برسم سیورغال انعام شد"

دوسرے وجوہ و اعیان مملکت کی طرح علامہ سیالکوٹی بھی جب کبھی شاہی دربار میں تشریف لاتے تو ان کی آمد درباری وقائع نویس سرکاری تاریخ میں قلمبند کرتا، عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں اس قسم کی متعدد تقریبات کا ذکر کیا ہے۔

مناظرے ان کے زمانہ میں جب کبھی دربار میں کوئی مدعی علم و فضل سر اٹھاتا تو اس کے مقابلے کیلئے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ہی کو زحمت دیجاتی، جب ملا شفیعا ایران سے آیا اور اس کے علم و فضل کا شہرہ بڑھا تو علامہ ہی کو اس سے مناظرے کے لیے بلایا گیا، اس مناظرے کی تفصیل امام الدین ریاضی نے تذکرہ باغستان میں دی ہے:

"آوردہ اند کہ پادشاہ شاہجہاں ایشاں را از سیالکوٹ برائے مناظرہ ملا شفیعا کہ تازہ

از ولایت آمد بود و خطاب دانشمند خاں یافتہ، طلبید۔ ایشاں آمدند و اجلاس علماء و فضلا شد۔ چوں نوبت سخن بمولوی عبد الحکیم رسید با دانشمند خاں مناظرہ واقع شد برائے ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ گفتگو بطول کشید و بالآخر درستی قول و راستی سخن ایشان بر پادشاہ و سائر علماء و امراء عالی شان انجامید۔" (باغستان ص ۶۴۴ ب ۶۴۵ الف)

مگر علامہ بحاث محض ہی نہ تھے، حق پسند اور منصف مزاج بھی تھے، ایک مرتبہ ملا محمود جونپوری سے مسئلۂ وحدت الوجود کے باب میں مناظرہ ہوا تو آخر میں علامہ نے فریق مقابل کی برتری کا اعتراف کرلیا۔ امام الدین ریاضی نے دوسری جگہ لکھا ہے:-

"ملا محمود جونپوری در فروع و اصول و معقول و منقول بکمال رسیدہ بود ...... مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی با وجود کمال خود بکمال جامعیت او اقرار و اعتراف بفضل و دانش او می نمود ...... مولوی عبد الحکیم در مناظرہ علم توحید با وے مقاومت نداشت۔ می فرمود کہ مولانا نفس قدسی است، تار و پود سخن را خاصہ بمنقولات بمنوالے بافتہ کہ کارنامۂ دیگراں در پیش او بمصد وقران او ہن البیوت لبیت العنکبوت ست تراز نسج عنکبوت است۔" (باغستان صفحہ ۶۴۴ ب ۶۴۵ الف)

یہ علامہ کی حق پسندی تھی ورنہ وہ بڑے بڑے اکابر سے بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے، ایک مرتبہ قاضی عبد الوہاب سے جو قاضی القضاۃ تھے کسی مسئلے میں مناظرہ ہو رہا تھا، علامہ بڑے جوش و خروش سے بول رہے تھے، قاضی صاحب نے کہدیا "مرد آدمی سخن آہستہ بگو"۔ پھر کیا تھا، علامہ بگڑ گئے اور قاضی القضاۃ کے منصب کا خیال کیے بغیر انھیں ڈانٹ دیا۔

علامہ کی علم دوستی کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ایک مرتبہ مولانا عوض وجیہ بلخی سپاہیانہ وضع میں علامہ کے درس میں تشریف لے گئے اور دوران تقریر میں علامہ پر اعتراض کیے، شام کو

علامہ کی سعد اللہ خاں علامی سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اس نووارد سپاہی کے اعتراضات کا ذکر کیا، علامی سعد اللہ خاں سمجھ گئے، بولے ارے تو وہ تو مولانا عوض وجیہ بلخی تھے۔ مولانا نے سنا تو حسرت و اشتیاق کے ساتھ فرمانے لگے۔

"ز آمدنش اگر خبر داشتمے درہ گزرش گل و یاسمن کاشتمے"۔

معاصرین و حریف

علامہ علم و فضل کے آفتاب نہیں تھے، ماہتاب تھے، اس عہد کے آسمان علم و فضل پر بیشمار درخشاں ستارے روشن تھے، بدر منیر علامہ کی ذات تھی، شاہجہاں کی علمی سرپرستی و جوہر شناسی کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے، اس عہد کی مشہور شخصیتوں میں بادشاہ کے وزیر علامی افضل خاں اور علامی سعد اللہ خاں کے علاوہ میرک شیخ ہروی، ملا علاء الملک تونی، سید احمد سعید، قاضی محمد اسلم، ملا عبد اللطیف، میر محمد ہاشم، شیخ عبد الحق محدث، ان کے صاحبزادے مفتی نور الحق، مفتی حسام الدین، مفتی رکن الدین، ملا عبد السلام لاہوری، مفتی عبد السلام دیوی، مولانا یوسف کیاہی، مولانا جمال الدین تلوی، مولانا الہداد، ملا فاضل بدخشی، ملا محمد افضل اور ان کے دو شاگرد ملا محمود جونپوری (مصنف شمس بازغہ) اور شیخ عبد الرشید جونپوری (مصنف مناظرۂ رشیدیہ) قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ کشمیر میں بھی جلیل القدر علماء تھے، جیسے قاضی ابو القاسم، مولانا حیدر فیروز، مولانا داؤد مشکوتی، ملا باقر صباغ، ملا باقر نارہ، ملا فاضل، ملا ابو الفضل عرف شاہم بابا۔ ان میں سے اکثر ان کے حریف نقاد تھے جیسے ملا باقر نارہ، جن کے بارے میں صاحب "واقعات کشمیر" نے لکھا ہے:-

"ملا باقر نارہ ملو۔ در معقولات شاگرد، ملا باقر صباغ بودہ در ہندوستان با ملا عبد الحکیم و علمائے پنجاب و پورب معارضہ کردہ و آنہا را ملزم می کرد۔"

ملا فاضل جن کے بارے میں محمد اعظم کشمیری نے لکھا ہے:

"ملا فاضل مرد دانشمند و محقق بود و بجمیل و بجائی اشتہار یافتہ اکثر حواشی ملا عبد الحکیم سیالکوٹی را رد می نوشت۔"

شاہم بابا جن کے بارے میں یہی مصنف لکھتا ہے :۔

"ملا ابوالحسن معروف بشاہم بابا در علوم مستعد و مجد بود...... اکثر مذکورات ملا عبدالحکیم را رد می کرد و گاہے التفات بجانب علمائے حاضر نمی کرد۔"

ہندوستانی فضلا میں مفتی عبدالسلام دیوی کا نام قابل ذکر ہے، انکے ساتھ علامہ کی غلط فہمی کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے، جس کی تفصیل آزاد بلگرامی نے "مآثر الکرام" میں میر اسمٰعیل بلگرامی کے تذکرے میں دی ہے۔

بہرحال علم و فضل کے اعتبار سے یہ بڑا روشن دور تھا، اور بیشمار علما، و فضلا سے مملکت شاہجہانی کی زیب و زینت تھی، مگر جب ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کی بحالی کا سوال پیدا ہوا تو شاہجہاں کی جوہر شناس نگاہوں نے ان درخشاں ستاروں میں سے اسی بدر کامل کا انتخاب کیا (اس کی تفصیل "الدرۃ الثمینۃ" کی وجہ تصنیف کے ضمن میں آگے آئیگی)

اور یہ اس فاضلِ عہد کی جلالتِ قدر اور علوئے مرتبت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

وفات | علامہ سیالکوٹی نے ۱۲ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے :۔

"دوازدہم ربیع الاول سنہ سبع و ستین و الف طومار حیات پیچید و در سیالکوٹ مدفون گردید"

اولاد امجاد و تلامذہ | تاریخ میں علامہ کی اولاد امجاد میں سے ان کے صاحبزادے مولانا عبد اللہ لبیب کا نام مذکور ہے، علامہ کو ان سے بے پناہ محبت تھی اور ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ رکھتے تھے، چنانچہ بہت سی کتابیں ان ہی کے واسطے تصنیف کیں۔

مولانا عبد اللہ لبیب بھی اپنے وقت کے جید عالم تھے، "توضیح تلویح" پر ان کا حاشیہ مشہور ہے۔ ایک رسالہ وحدت الوجود کی تائید میں عالمگیر کی استدعا پر مرتب کیا تھا جیسا کہ امام الدین ریاضی نے لکھا ہے :۔

"آوردہ اند کہ بادشاہ بدیشاں گفت کہ والد شما مسئلۂ وحدۃ الوجود چہ طور تلقین شاگرداں کردہ اند۔ آنرا می خواہیم از زبان شما شنویم کہ گویا از مولوی مرحوم شنیدہ باشیم ایشاں خود دراں وقت بجواب اجمالی کہ مقتضائے وقت بود اکتفا کردند و گفتند کہ چوں ایں سخن شرح طلب است، اگر امر شود بزودی رسالہ موجزے در حل ایں رمز شگرف تحریر نمودہ بسمع مبارک رسانند۔ فرمود بہتر۔ چنانچہ اخوند در اندک زمنے رسالہ بسیار خوب در حل مسئلہ وحدۃ الوجود تصنیف کردہ بعرض رسانیدند و فقیر ایشاں را ہم دراں ایام دریافتہ آں رسالہ حاصل نمودہ بمطالعہ در آوردہ۔"

(باغستان، ص ۴۸۴ ب)

لیکن علامہ کا علمی فیض انکے تلامذہ کے ذریعے زیادہ پھیلا۔ امام الدین ریاضی نے لکھا ہے :۔

"و بالجملہ از رایات جلال او شاگرداں صاحب کمال اند از انجملہ است: ملا سعد اللہ مخاطب بسعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں بادشاہ صاحبقراں کہ نشان مذکور او فضل او نشان می دہد...... و از انجملہ است ملا عبد العزیز عزت کہ در زمان خلافت عالمگیر خدمت عرض مکرر داشت...... و از انجملہ است ملا عصمت اللہ سہارنپوری کہ بر خلاصۃ الحساب و تشریح الافلاک شیخ بہاؤ الدین محمد عاملی شرح نوشتہ اند و از رایات کمال او فرزند صاحب حال است مولوی عبد اللہ" (باغستان صفحہ ۴۸۶ الف)

ان کے علاوہ ان کے ایک اور شاگرد مولوی عبدالرحیم مراد آبادی تھے، جن کے سلسلۂ تلمذ میں قاضی مبارک گوپاموی (شارح سلّم العلوم) شمار ہوتے ہیں، ایک اور شاگرد میر اسمٰعیل بلگرامی تھے، جو پہلے مفتی عبدالسلام دیوی کے شاگرد ہوئے تھے۔

تصانیف | علامہ کثیر الدرس ہونیکے ساتھ ساتھ کثیر التصنیف بھی تھے، آزاد بلگرامی نے انکی

کتابوں کی ایک مبسوط فہرست دی ہے جو حسب ذیل ہے:۔

۱۔ حاشیہ تفسیر بیضاوی
۲۔ حاشیہ مقدمات تلویح
۳۔ حاشیہ مطول
۴۔ حاشیہ شرح فقیہ
۵۔ حاشیہ شرح مواقف
۶۔ حاشیہ شرح عقائد تفتازانی
۷۔ حاشیہ حاشیہ خیالی
۸۔ حاشیہ شرح شمسیہ
۹۔ حاشیہ حاشیہ عبد الغفور
۱۰۔ تکملہ حاشیہ عبد الغفور
۱۱۔ حاشیہ شرح مطالع
۱۲۔ حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی
۱۳۔ درہ ثمینہ در اثبات واجب تعالیٰ (؟)
۱۴۔ حواشی درکنار شرح حکمۃ العین
۱۵۔ حواشی درکنار شرح ہدایۃ الحکمۃ
۱۶۔ حواشی درکنار مراح الارواح

ان میں سے ہمارے نقطۂ نظر سے "درہ ثمینہ" سب سے زیادہ اہم ہے، اسی کا تعارف آگے آرہا ہے، آزاد بلگرامی نے اس کا موضوع اثبات واجب تعالیٰ بتایا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس کی توضیح اگلی قسط میں پیش کیجائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

(باقی)

(دوسری نئی کتاب)

کشمیر سلاطین کے عہد میں

اس میں مغل فرمانرداؤں سے پہلے جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت کشمیر میں رہی اسکی ہر قسم کی بہت مفصل تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

مترجمہ: علی حماد عباسی صاحب ایم اے اعظمی ۔ قیمت ۹ لعہ

منیجر

تفسیر فتح العزیز

چند حقایق کی روشنی میں

از

جناب محمد عضد الدین خاں صاحب ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے علمی کارناموں میں ان کی تحفہ اثنا عشریہ اور تفسیر فتح العزیز دو اہم تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اول الذکر اپنے موضوع پر یقیناً حرف آخر ہے۔ اور اس لحاظ سے شاہ صاحب کا اہم ترین کارنامہ ہے، اسی کے ساتھ ساتھ ان کی تفسیر بھی انتہائی علمی اہمیت کی حامل ہے، بلکہ ایک لحاظ سے تحفہ سے بھی اہم ہے، شاہ صاحب کی گوناگوں علمی وادبی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ اسی تفسیر سے ہوتا ہے، وہ اس تفسیر میں بیک وقت نحوی بھی نظر آتے ہیں اور متکلم بھی، محدث بھی اور صوفی بھی، فقیہ بھی اور ادیب بھی، اس کے علاوہ اس تفسیر میں نظم قرآنی اور دوسرے تفسیری نکات جتنے خوبصورت پیرائے میں ملتے ہیں، شاید ہی کسی ہندوستانی تفسیر میں اس وقت تک بیان کیے گئے ہوں، اسی لیے خود شاہ عبد العزیز صاحب بھی اس معرکۃ الآرا تفسیر پر فخر و مسرت محسوس فرماتے تھے، چنانچہ اپنے شاگرد مرزا حسن علی محدث کے ایک خط کے جواب میں جو اصل میں تحفہ اثنا عشریہ کے معترضین کے جواب کے سلسلے میں تھا تحریر فرماتے ہیں:۔

"...... وسہندا جائے طعن معاندان و حاسدان وقتے متوجہ فقیر می تواند شد کہ ایں

نقیر دعوی تصنیف این کتاب موجب افتخار خود دانسته تقریراً و تحریراً بقلم زبان از زبان قلم کرده باشد معلوم است کہ این کتاب را تصنیف حافظ غلام حلیم ابن شیخ قطب الدین احمد ابن شیخ ابو الفیض نوشتہ ام اگر منظور دعوے نسبت این کتاب بخود می بود چرا اینقدر اخفا بنامہاے غیر معروف بعمل می آوردم بلکہ حالا ہم ہرگز بنسبت این کتاب بطرف خود خوش نمیشوم آرے اگر تفسیر فتح العزیز و امثال این تصانیف را اگر بفقیر نسبت کنند موجب شادمانی خاطر میگردد۔

ان کی اس اہم تفسیر کے سلسلے میں دو متضاد روایات ملتی ہیں، بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے یہ تفسیر مکمل نہیں کی تھی، بلکہ شروع کے سوا پاروں سے کچھ زیادہ اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر فرمائی تھی، اور بعض شواہد سے اس کا قوی گمان ہوتا ہے کہ یہ تفسیر اگر لکھی گئی تو مکمل ہی لکھی گئی۔ اس مضمون میں اصل حقیقت کی تلاش کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہ عبد العزیز صاحب نے یہ تفسیر ۴۹ برس کی عمر میں ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۳ء میں لکھی، یہ وہ زمانہ تھا جب شاہ صاحب متعدد موذی امراض کا شکار ہو چکے تھے، اور ان کی بصارت بھی تقریباً جاتی رہی تھی، جیسا کہ انھوں نے خود تفسیر کے مقدمے میں تحریر فرمایا ہے، تفسیر لکھنے کا سبب خود شاہ عبد العزیز صاحب کے بیان کے مطابق مولانا شاہ فخر صاحب کے مرید شیخ مصدق الدین عبد اللہ کی خواہش اور ان کا شوق تھا، چونکہ بصارت اس وقت تقریباً زائل ہو چکی تھی اسلیے تفسیر کو خود لکھنے کے بجائے املا فرمایا تھا۔[2]

یہ تفسیر غیر مکمل پائی جاتی ہے یعنی اس میں صرف سورۂ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی شروع کی ۱۸۴ آیتوں "وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون" تک کی تفسیر ہے جو سوا پاروں سے کچھ زائد پر مشتمل ہے، اس کے بعد آخر کے دو پاروں کی تفسیر ہے، جو متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

---

[1] مجموعۂ فتاویٰ عزیزی جلد اول ص ۱۳۰، [2] تفسیر فتح العزیز (مقدمہ) ص ۳

اس سلسلے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی تھی، یا پورے قرآن شریف کی؟ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی جتنی کہ آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے،

اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ صرف اتنی ہی تفسیر قلمی یا مطبوعہ شکل میں ملتی ہے، اور یہ گمان ...... بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے پوری تفسیر لکھی تھی جس کا بیشتر حصہ کسی وجہ سے ضائع ہو گیا، کیونکہ ان کی کوئی اور تصنیف ضائع نہیں ہوئی، ایسی حالت میں صرف اسی تفسیر کے حصوں کا ضائع ہو جانا قرین قیاس نہیں ہے، اس کے علاوہ شاہ عبد العزیز صاحب کے مختلف تذکرہ نگاروں نے بھی عام طور پر یہی لکھا ہے کہ یہ تفسیر نامکمل رہی، چنانچہ مولوی رحمان علی (۱۲۴۴ھ تا ۱۳۲۵ھ) نے اپنی کتاب تذکرہ علمائے ہند میں بھی یہی لکھا ہے۔

مقالات طریقت میں بھی جو شاہ صاحب کے حالات میں اہم تذکرہ ہے، صراحت سے مذکور ہے کہ شاہ صاحب اپنی زندگی میں اس تفسیر کو مکمل نہ کر سکے، اس لیے ان کے شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی (م ۱۲۹۹ھ) صاحب منتہی الکلام نے نواب سکندر بیگم والیہ بھوپال کی خواہش پر اس کو ستائیس جلدوں میں مکمل کیا، صاحب مقالات طریقت کا کہنا ہے کہ انھوں نے خود اس تفسیر کو دیکھا ہے،[1]

مگر یہ عام خیال کہ شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی جتنی آج مطبوعہ شکل میں

---

[1] مقالات طریقت از عبد الرحیم ضیا، حیدرآباد ۱۲۹۲ھ ص ۳۳۔ راقم الحروف کو حیدر علی صاحب کی تفسیر کی تمام جلدیں دستیاب نہ ہو سکیں، صرف آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں اس کے چند اجزا ملے جن میں کسی طرح کا مقدمہ یا کوئی ایسی عبارت نہیں ہے جس سے اندازہ ہو سکے کہ یہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی تفسیر کا تکملہ ہے۔

موجود ہے، مندرجۂ ذیل وجوہ سے بہت کمزور اور مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱) شاہ عبد العزیز صاحب کی مختلف عبارات سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی، ان کے فتاوی میں جابجا ایسی سورتوں کی تفسیر کے حوالے ملتے ہیں جو اس وقت قلمی یا مطبوعہ شکل میں نہیں پائے جاتے، مثلاً یہاں چند عبارتیں نقل کیجاتی ہیں، ایک جگہ تفسیر کے سلسلے میں پوری بات لکھنے کے بعد یہ لکھتے ہیں:

"...نقلاً عن مسودۃ فتح العزیز فی سورۃ آل عمران قولہٗ تعالیٰ قل اٰمنا باللہ وما انزل علینا فقط"[1]

فتح العزیز کے مسودہ سے یہ عبارت نقل ہو جو سورۂ آل عمران کی تفسیر میں قل آمنا باللہ وما انزل علینا کے تحت مذکور ہے۔

ایک دوسری جگہ یہ عبارت ملتی ہے:-

"و ایں فقیر در تحت آیت اولٰئک یوتون اجرھم مرتین[2] تحقیق نفیس نوشتہ کہ ایں وقت نقل آں بسبب دور افتادن مسودات متعذر است[3]"

ایک جگہ سورہ حدید کی آیت ھو الذی خلق السموات والارض فی ستۃ ایام کی تفسیر کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:-

"چنانچہ تفصیل آں دفعات در سورۂ سجدہ مذکور است و در تفسیر فتح العزیز شرح آں بوجہ مستوفی مذکور شد چوں ایں وقت حواس درست نبود نقل از مسودات آں ممکن نشدہ[4]"

اسی طرح فتاوی کی دوسری جلد کے صفحہ ۴۳ پر یہ عبارت ملتی ہے:-

من تفسیر فتح العزیز فی سورۃ النساء

تفسیر فتح العزیز میں سورہ نساء کی آیت

---

[1] فتاوی عزیزی۔ ج دوم (مجتبائی پریس دہلی ۱۳۱۴ھ) ص ۴۹ [2] یہ آیت سورہ قصص یعنی بیسویں پارے کی ہے۔

[3] فتاوی عزیزی ج دوم ص ۷۱ [4] ایضاً

تحت قولہ تعالیٰ کلما نضجت جلودھم بدلناھم جلوداً غیرھا لیذوقوا العذاب

کلما نضجت جلودھم بدلناھم جلوداً غیرھا لیذوقوا العذاب کی تفسیر کے تحت دیکھا ہے کہ

....

اسی کے دوسرے صفحے پر یہ عبارت ملتی ہے:

"ایضاً منھا (ای من تفسیر فتح العزیز) من سورۃ الصافات من باب اسرار القصص تحت قولہ ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون...... سینفصل تفصیلاً لایقا فی تفسیر سورۃ الزخرف انشاء اللہ تعالیٰ

اور یہ عبارت بھی تفسیر فتح العزیز کی سورۃ الصافات میں اسرار القصص کے ذکر میں قرآن شریف کی آیت ولقد سبقت الخ کی تفسیر سے ماخوذ ہے...... اور انشاء اللہ تعالیٰ اس امر کی مناسب تفصیل سورہ زخرف کی تفسیر میں بیان کروں گا۔

اس کے علاوہ انہی فتاوی کے صفحہ ۳۶ پر مندرجۂ ذیل عبارت ملتی ہے:

من تفسیر فتح العزیز تحت قولہ تعالیٰ ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ فان قلت ما السر فی ان الادعیۃ الواردۃ فی الکتاب العزیز کلھا مصدرۃ بقولہ ربنا الا نادراً

تفسیر فتح العزیز میں آیت ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اگر یہ خیال ہو کہ کیا وجہ ہے کہ قرآن شریف میں بعض کو چھوڑ کر جتنی دعائیں ہیں سب ربنا سے شروع ہوتی ہیں......

یہ بات عجیب ہے کہ اس وقت تفسیر فتح العزیز کا جو حصہ مطبوعہ شکل میں ملتا ہے وہ مذکورہ بالا آیت یعنی ربنا اتمنا الخ سے سولہ آیت پہلے ختم ہوجاتا ہے، یعنی اس وقت مطبوعہ تفسیر میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۴ تک کی تفسیر ہے اور یہ آیت اس تفسیر کی آخری آیت سے سولہ آیتوں کے بعد ملتی ہے۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے یقیناً تفسیر فتح العزیز مکمل کرلی تھی، اسی لیے انھوں نے اس کے حوالے اپنے خطوط میں لکھے ہیں جو آج فتاوی کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

فتاوی عزیزی کی مندرجۂ بالا عبارات کی تصدیق ایک دوسری کتاب سے ہوتی ہے جس کا نام ہے افادات عزیزیہ[1]۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد شاہ رفیع الدین مرادآبادی نے مختلف قرآنی موضوعات پر شاہ عبدالعزیز صاحب کے خیالات کو خود شاہ عبدالعزیز صاحب کی زندگی ہی میں ایک جگہ کتابی صورت میں جمع کیا تھا، جس کا نام انھوں نے "افادات عزیزیہ" رکھا تھا، یہ خیالات زیادہ تر خود شاہ صاحب کی ہی عبارت میں تھے، جو انھوں نے شاہ رفیع الدین صاحب کو خطوط کی شکل میں لکھے تھے، اس کتاب کے مقدمے میں یہ عبارت ملتی ہے:

"فرید دہر و وحید عصر..... شاہ عبدالعزیز سلمہ اللہ تعالی..... تفسیر کہ مسمی بفتح العزیز

---

[1] مولانا نسیم احمد فریدی امروہی صاحب نے اس کتاب کا نام "اسولہ واجوبہ" تحریر فرمایا ہے۔ (ملاحظہ ہو ان کا مضمون سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (الفرقان مئی ۱۹۶۷ء) حالانکہ اس کا اصل نام افادات عزیزیہ ہے۔ انھوں نے اس نسخہ کو مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں بھی بتلایا ہے، شاید دونوں کے سلسلے میں مولانا کو تسامح ہوا، دارالعلوم ندوہ کے کتب خانے میں جہاں سے مولانا نے عبارت لی ہے، اس کے دو نسخے اسی افادات عزیزیہ کے نام سے موجود ہیں۔

تألیف نمودہ وہنوز مسودات آں بہ بیاض نہ رسیدہ و تحقیقات بسیار و لطائف بیشمار دراں محرر شدہ لیکن پنج علم باستقلال باں مخصوص است اول عنوانات سور و ضبط مضمون ہر سورہ اجمالاً، دوم ربط آیات بعضہا مع بعض، سوم متشابہات القرآن، چہارم اسرار القصص والاحکام، پنجم لطائف نظم قرآن، ومصنف سلمہ اللہ تعالی بفقیر محمد رفیع الدین جستہ جستہ نمونہ از ہر پنج علم در مکاتیب نوشتہ وبعض سوالہا کہ فقیر ازاں استفسار نمودہ جوابہا آں در مکاتیب نوشتہ اند ہمہ آنرا دریں اوراق نقل کردہ شد"

مندرجۂ بالا عبارت سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن کی تفسیر لکھی تھی، ورنہ شاہ رفیع الدین صاحب اس کا ضرور ذکر فرماتے، یا کم از کم تفسیر کے متعلق وہ الفاظ نہ لکھتے جو انھوں نے لکھے ہیں، اس کے علاوہ خود اس کتاب میں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر کی ان سورتوں کی تفسیر کے حوالے ملتے ہیں جو آج کل قلمی یا مطبوعہ شکل میں موجود نہیں ہیں جن سے اس کی پوری تصدیق ہوجاتی ہے کہ شاہ صاحب نے تفسیر یقیناً مکمل کرلی تھی، اس کتاب کی اکثر عبارتیں عربی میں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ غالباً شاہ عبدالعزیز صاحب نے شاہ رفیع الدین صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ عربی میں تھے، اسی لیے انھوں نے تفسیر فتح العزیز سے ضروری مقامات کا ترجمہ یا خلاصہ عربی ہی میں دیا ہے، اس کتاب کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر فتح العزیز شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات سے بہت پہلے یعنی ۱۲۰۵ھ کے قریب مکمل ہوچکی تھی، اس لیے کہ افادات عزیزیہ کے مرتب شاہ رفیع الدین صاحب کا انتقال ۱۲۱۸ھ یا ۱۲۲۳ھ[1] میں ہوا ہے، اور خود اس

---

[1] ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے، تذکرہ علمائے ہند میں ۱۲۱۸ھ اور نزہۃ الخواطر میں ۱۲۲۳ھ ہے۔

اس کتاب کے اندر، ایک دو جگہ جو تاریخیں ملتی ہیں، مثلاً ۲۸ صفر ۱۲۱۵ھ یا جمعہ ۱۹ صفر ۱۲۱۵ھ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر ۱۲۱۵ھ سے پہلے مکمل شکل میں تحریر ہو چکی تھی، جبھی شاہ صاحب ان کے حوالے ۱۲۱۵ھ کے خطوط میں دیتے ہیں۔[1]

---

[1] مولانا نسیم احمد فریدی امروہی صاحب اپنے حالیہ مضمون "سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ملفوظات" میں جو جولائی کے الفرقان میں شائع ہوا ہے، ملفوظات کے مندرجہ ذیل قطعے سے عجیب و غریب نتیجہ نکالتے ہیں، وہ قطعہ یہ ہے:-

جامع علم و عمل، شیخ الوری عبدالعزیز — آنکہ او اندر جوانی کار پیران می کند

بسکہ استمداد، دارد از سحاب معنوی — بحر مواجے است چوں تفسیر قرآں میکند

اس قطعہ کا ترجمہ لکھنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں:- "اس قطعہ سے معلوم ہوا کہ آپ نے تفسیر فتح العزیز جوانی کے زمانے میں لکھی تھی"۔ (الفرقان جولائی ۱۹۶۷ء ص ۳۰)۔ پتہ نہیں مولانا نے آخری مصرعے سے تفسیر فتح العزیز کی تصنیف کا نتیجہ کیسے نکالا، اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ جب قرآن شریف کی تفسیر بیان فرماتے ہیں تو گویا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر معلوم ہوتے ہیں، اس سے بیان تفسیر مراد ہے نہ کہ تصنیف، اگر مولانا کی رائے مان لی جائے تو شاہ عبدالعزیز صاحب نے خود مقدمے میں جو سنہ تالیف یعنی ۱۲۰۸ھ دیا ہے، غلط ہو جائے گا اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کی یہ بات بھی غلط ہو جائے گی کہ شاہ صاحب نے تفسیر لکھی جو ابھی بیاض تک نہیں پہنچی ہے، شاہ رفیع الدین صاحب نے ۱۲۰۳ھ میں سفر حرمین سے واپسی کے بعد افادات عزیزیہ کی ترتیب ۱۲۱۵ھ کے بعد کی ہے، اگر انھوں نے جوانی ہی میں اسے تحریر فرمایا تھا تو اس وقت تک تو پوری تفسیر شائع ہو جانی چاہیے تھی جس طرح تحفہ خود شاہ صاحب کے زمانے ہی میں شائع ہو گئی۔ اس کے علاوہ جوانی میں اگر تفسیر لکھی جاتی تو اس کے مقدمے میں صحت کی خرابی، مختلف بیماریوں کی وجہ سے سخت ذہنی انتشار کا اس قدر ذکر نہ فرماتے، اس لیے اس طرح کے نتائج نکالنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔

اس کے علاوہ ایک اور قدیم اور نایاب تذکرہ یعنی مقالات طریقت کی روایت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ شاہ صاحب نے پوری تفسیر لکھی تھی، مقالات طریقت میں صفحہ ۳۲ پر یہ عبارت ملتی ہے:-

"حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری سلمہ اللہ تعالیٰ مولوی نور اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک تفسیر تمام قرآن مجید کی اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود ہے مگر وہ چھپی نہیں۔"

یہ ہیں دو طرح کی متضاد روایات جن سے ایک طرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن مجید کی تفسیر نہیں بلکہ شروع کے سوا پاروں کے قریب اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر لکھی اور دوسری طرف چند روایات ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے یقیناً پورے قرآن شریف کی تفسیر لکھی تھی، یہی نہیں بلکہ ایک ہی کتاب میں دو طرح کی باتیں ملتی ہیں، مثلاً مقالات طریقت میں ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے تفسیر مکمل نہیں کی تھی، اور مولانا حیدر علی فیض آبادی نے اس کا تکملہ کیا، دوسری طرف یہ روایت ہے کہ اکبرآباد کے قاضی کے یہاں پورے قرآن مجید کی تفسیر موجود ہے، مگر وہ چھپی نہیں؟ آخر یہ تضاد کیوں اور کیسے ہوا؟ اور ان متضاد روایات میں کس کو صحیح سمجھا جائے، اور ان میں کس طرح تطبیق دی جائے؟

اس سے پہلے کہ ہم اس تضاد کے وجوہ اور تطبیق کی صورتوں پر غور کریں، ایک اہم سوال کا جواب دینا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ اگر شاہ صاحب نے پوری تفسیر لکھی تو کیا ان کی مکمل تفسیر کا کوئی مطبوعہ یا قلمی نسخہ اس وقت کہیں پایا جاتا ہے؟ راقم الحروف کو ہندوستان کے بیشتر مشہور کتب خانوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، مگر کسی میں مکمل تفسیر نہ مل سکی، البتہ دو چیزیں ایسی ملیں جو شاہ صاحب کی تفسیر سے متعلق ہو سکتی ہیں، پہلی چیز ایک تفسیر کے چند صفحات ہیں جو قلمی شکل میں

کتب خانہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ (ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سابق ناظم ندوہ) کے کتب خانے نمبر ۲،۷ کے تحت موجود ہیں، جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نام سے منسوب ہے، یہ سورۂ مائدہ کی تیسری آیت سے ۳۷ ویں آیت تک کی تفسیر پر مشتمل ہے، اور مخطوطہ کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:-

"تمام شد تفسیر چند آیات سورہ مائدہ تصنیف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ہشتم جمادی الاول روز پنجشنبہ در لکھنؤ در عمل نصاری سنہ ۱۲۷۷ ہجری، الحمد للہ رب العلمین صلوۃ اللہ وسلامہ علی محمد خیر خلقہ و اصحابہ اجمعین"۔

دوسری چیز ایک مطبوعہ تفسیر "تفسیر عزیزی المعروف بہ وعظ عزیزی" ہے، یہ تفسیر مجھے اپنے ایک محترم بزرگ مولانا مسیح الزماں صاحب قاسمی کے ذاتی کتب خانہ میں ملی ہے، جو سورۃ المومنون سے لیکر سورۂ یٰسین تک کی فارسی تفسیر اور ۲۵۹ صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، مگر سنہ طباعت درج نہیں ہے، البتہ کتاب کے مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں شائع ہوئی ہے، اس وعظ کے مرتب شاہ صاحب کے ایک شاگرد مولانا ابو الفرید امام الدین[1] صاحب ہیں، چنانچہ شروع میں اپنے حالات اور شاہ صاحب سے اپنا تلمذ اور شاہ صاحب کے سلسلے میں ایک مثنوی لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"چون معمول قدیم آن سر حلقہ ورثۃ الانبیاء بود کہ روز سہ شنبہ و جمعہ درس قرآن

---

[1] مولانا سید عبدالحئی لکھنوی صاحب نزہۃ الخواطر ان کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کی نسبت کی وجہ سے ان کا لقب بھی حجۃ اللہی پڑ گیا تھا، اس لیے کہ شاہ صاحب کو اس وقت لوگ حجۃ اللہ کہا کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر جلد ۷، ص ۷۶) ان ہی امام الدین صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت سی شاہ صاحب کی کتابیں رضا لائبریری رام پور میں موجود ہیں۔

و حدیث مفید بود و ربط سور و آیات بیک دگر لصد ہزار نکات بتوضیح تام دلنشین ہر خاص و عام شدی و اسرار احادیث علی صاحبہا الصلوۃ والسلام بتشریح تمام مفہوم ہر وضیع و شریف گشتہ بندہ بہ تحریر تقریر دلپذیرش کہ ہمت چست بہ بستم و باین سعادت عظمی از سورہ مومنون تا والصافات بہرہ ور گشتم، چون کل امر مرہون باوقاتہا در سنہ یکہزار و دو صد و پنجاہ و نہ ہجری مسودہ مذکورہ را نظر ثانی نمودم و مرۃ بعد اولی بر تسویدش زنگ حسرت از دل احباء زدودم۔ ابیات

شنیدم آنچہ در ہر درس تقریر	نمودم جستہ جستہ تحریر
ندارم خواہش اجرت من از کس	امید اجر دارم از خدا بس

اس کتاب کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ درحقیقت یہ شاہ صاحب کے درس کے نوٹ ہیں جنہیں امام الدین صاحب نے دوران درس میں قلمبند کیا ہے، اسی وجہ سے مفصل نہیں ہے، مگر انداز بالکل وہی ہے جو تفسیر فتح العزیز کا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ فتح العزیز مفصل ہے اور مستقل تصنیف اور وعظ عزیزی ان کے درس کا خلاصہ ہے۔

"وعظ عزیزی" میں ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ فتاوی عزیزی میں جو عبارتیں تفسیر فتح العزیز سے متعلق ملتی ہیں، جن میں سے چند کا ذکر ہم نے شروع میں کیا ہے، وہ عبارتیں اس وعظ عزیزی سے ماخوذ نہیں ہیں، گو وعظ عزیزی میں بھی بعض اس طرح کی باتیں ملتی ہیں مگر بہت مختصر اور الفاظ بھی بالکل مختلف ہیں، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عبارتیں اسی سے لی گئی ہیں۔

اس سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شاہ صاحب نے غالباً اپنے درس میں پورے قرآن مجید کی تفسیر فرمادی تھی جس کا ایک حصہ امام الدین صاحب نے قلمبند کر لیا تھا، جو شائع ہو گیا ہے

ممکن ہے ان کے شاگردوں میں سے کسی اور نے بھی اس طرح سے درس کے نوٹ لیے ہوں اسکے بعد شاہ صاحب نے پورے قرآن مجید یا کم از کم اس کے زیادہ حصے کی تفسیر درس میں یا وعظ میں فرمادی ہو، تو یہ بات قرین قیاس ہے کہ بعد میں لوگوں کے اصرار پر اسے املا بھی کرادیا ہو، جبکہ واقعہ بھی ہے۔ کیونکہ تفسیر فتح العزیز جو اس وقت مطبوعہ شکل میں موجود ہے وہ املائی ہے[1]

اب آیئے خود تفسیر فتح العزیز کے مقدمے کو دیکھیں، اس مقدمے میں شاہ صاحب حمد و ثنا اور اپنا تعارف جیسا کہ کتاب کے شروع میں لکھا جاتا ہے، کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"درسنہ یکہزار و دو صد و ہشت از ہجرت مقدسہ نبویہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ و الف الف تحیۃ بجاذبہ شوق و داعیہ عزم برادر دینی جوہر[2] نتیجہ حق گزینی سالک راہ خدا

---

[1] پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب تاریخ مشائخ چشت میں صفحہ ۲۹۴ پر فرماتے ہیں کہ "مسلم یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں "تفسیر عزیزیہ کا ایک قلمی نسخہ (کتبہ ۱۲۴۹ھ) ہے اشیخ مصدق الدین جو شاہ فخر صاحب کے مرید تھے شاہ عبدالعزیز صاحب کے درس تفسیر میں شریک ہوتے تھے اور جو کچھ سنتے تھے "لفظ بلفظ اور ادر سلک تحریر کشیدند" (ص ۲) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے جب اس مجموعہ کو ملاحظہ فرمایا تو ایک مقدمہ لکھا" پتہ نہیں پروفیسر نظامی صاحب نے یہ کیسے نتیجہ نکالا کہ شیخ مصدق الدین صاحب جو کچھ شاہ صاحب کے درس میں سنتے تھے اس کو لکھتے گئے اور بعد میں اس مجموعے کو دیکھکر شاہ صاحب نے اس پر مقدمہ لکھ دیا، حالانکہ خود اس مخطوطہ میں اور اسی طرح اور تمام مطبوعہ نسخوں میں لفظ بلفظ اورا در سلک تحریر کشیدند سے پہلے یہ عبارت بھی موجود ہے...... "تفسیرے بلغت فارسی بحسب روزمرہ متعارف ایں دیار و استعمال تمثیلات رائج ایں روزگار و حذف تطویلات لاطائل اہل عربیت و اسقاط توجیہات بعیدہ مبنیہ بر روایات بے وثاق املا نمودہ و آں برادر دینی لفظ بلفظ اورا در سلک تحریر کشیدند" نظامی صاحب کو شاید اس سلسلے میں سہو ہوا [2] نظامی صاحب مشائخ چشت میں اسی صفحہ پر مذکورہ بالا اقتباس کے بعد تحریر فرماتے ہیں: "اس میں ایک جگہ مصدق الدین کی شاہ فخر صاحب سے نسبت ارادت کا ذکر کرتے ہیں تو اس طرح لکھتے ہیں (بقیہ

جوئی ملازم طریقۂ صدق گوئی مقبول جناب عالی قباب خلائق مآب مولانا و بالفضل اولانا فخر الملۃ والدین محمد قدس سرہ الامجد شیخ مصدق الدین عبداللہ وفقہ اللہ لما یحبہ و یرضاہ...... کہ اولاً برائے ایضاح معانی سورۂ فاتحۃ الکتاب و دو سیپارہ آخرین از حضرت قرآن مجید نفعنا اللہ بآیاتہ فی الدنیا والآخرہ کہ اکثر مسلمین در صلوٰۃ خمسہ و جمعہ و جماعات و محافل و اوراد مقدسہ انبیاء و اولیاء و زیارت قبور صلحاء و عرفا بتلاوت ایں سور با شرف و استعداد می نمایند و تعطش بدریافت مضامین آنہا بہم میرسانند و ثانیاً باستیناف از سورہ بقرہ کہ بحکم ؎

شربت الحب کاساً بعد کاس فما نفد الشراب و ما رویت

مزید رغبت بحل حقایق و دقایق کلام الٰہی قرار دادہ اند تفسیرے بلغت فارسی بحسب روزمرہ متعارف ایں دیار و استعمال تمثیلات رائج ایں روزگار و حذف تطویلات لاطائل اہل عربیت و اسقاط توجیہات بعیدہ مبنیہ بر روایات بے وثاق املا نمودہ"

اگر مقدمے کی مندرجۂ بالا عبارت کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے دو اہم نتائج نکلتے ہیں

(۱) یہ مقدمہ اس وقت لکھا گیا ہوگا جب تفسیر موجودہ صورت میں لکھکر تیار ہوگئی ہوگی۔

(۲) کم از کم سورہ بقرہ کی تفسیر مکمل لکھی گئی ہوگی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۸) "برادر دینی جوہر...... حق گزینی، سالک راہ خدا جوئی، ملازم طریقۂ صدق گوئی مقبول جناب مولانا عالی، جناب خلائق مآب و بالفضل اولانا فخر الملۃ والدین محمد قدس سرہ الامجد" اس سلسلے میں بھی غالباً نظامی صاحب کو غلط فہمی ہوئی، اسلئے کہ برادر دینی سے صدق گوئی تک کی عبارت شیخ مصدق الدین صاحب کی تعریف میں ہے، اس کے بعد مولانا عالی قباب سے شاہ فخر صاحب کی نسبت ذکر ہے، اصل مسودہ میں عبارت "مقبول جناب مولانا عالی قباب" ہے نہ کہ "عالی جناب"۔

مگر عجیب اتفاق ہے کہ تفسیر فتح العزیز کے پہلے حصے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کوئی بھی صورت نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تفسیر سورہ بقرہ کے ۲۳ ویں رکوع کی دوسری آیت کی تفسیر کرتے کرتے اچانک ختم ہوجاتی ہے، حتیٰ کہ آخری جملہ بھی مکمل نہیں ہوسکا، وہ آخری اور نامکمل جملہ یہ ہے:

"و در ترمذی و نسائی و دیگر کتب معتبرۂ حدیث از آنحضرت صلعم روایت آوردہ کہ حق تعالیٰ حضرت یحییٰ پیغمبر را پنج چیز حکم فرمودہ بود کہ خود ہم بداں عمل نمایند و بنی اسرائیل را نیز بفرمایند تا موافق آں عمل کنند حضرت یحییٰ علیہ السلام بنابر تمرد بنی اسرائیل در اظہار آں احکام توقف فرمودند حضرت عیسیٰ علیہ السلام را وحی شد کہ بحضرت یحییٰ بگویند کہ حق تعالیٰ شما را"

اس سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی تھی جتنی کہ آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے، تو شاید اس کا کوئی جواب نہیں ہے، کہ شاہ صاحب نے اس رکوع یا کم از کم اس آیت ہی کی تفسیر کیوں نہ مکمل کردی، جسے انھوں نے شروع کیا تھا، یا آخری جملہ کیوں نہ مکمل کردیا جس کا بڑا حصہ لکھ چکے تھے؟ اس کے جواب میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے بعد شاہ صاحب اچانک بیمار پڑ گئے اور اس کے بعد انتقال ہوگیا ہوگا، اس لیے کہ خود اس مقدمے کے مطابق شاہ صاحب نے یہ تفسیر ۱۲۰۸ھ میں لکھی اور شاہ صاحب کا انتقال اس کے ۳۱ برس کے بعد ۱۲۳۹ھ میں ہوا، اس اکتیس سال کے دوران اتنا تو بہرحال ہوسکتا تھا کہ وہ جملہ یا وہ رکوع مکمل کرسکتے تھے، حالانکہ مقدمہ کو لکھنے سے پہلے امید یہی کیجاتی ہے کہ شاہ صاحب نے سورہ بقرہ تو ختم ہی کرلی ہوگی اس لیے کہ ناتمام جملہ لکھکر یہ طے کرلینا کہ اب اس کے آگے نہ لکھا جائیگا اور مقدمہ لکھکر بات ختم کردینا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ شاہ صاحب کی تصانیف کے اصل یا کم از کم ان کے زمانے کے قلمی نسخے نہیں ملتے، جو بھی ملتے ہیں سب بعد کے ہیں، مجھے اس سلسلے میں سب سے قدیم جو قلمی نسخہ تفسیر فتح العزیز کا مل سکا ہے وہ ۱۲۴۹ھ کا مکتوبہ ہے، یہ نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں محفوظ ہے، اس کے مقدمے میں سورہ بقرہ کی تفسیر سے متعلق جو جملہ عام طور پر مطبوعہ نسخوں میں ملتا ہے، مجھے نہیں ملا جس سے اور شبہہ پیدا ہوا، بلکہ یقین سا ہوچلا ہے کہ شاید یہ جملہ بعد میں بڑھایا گیا ہے،

تفسیر فتح العزیز کے سلسلے میں مذکورہ بالا حقائق کو سامنے رکھکر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ مندرجۂ ذیل ہے:

شاہ عبدالعزیز صاحب نے جیسا کہ مقدمہ سے ظاہر ہے، غالباً پہلے سورہ فاتحہ اور آخر کے دو پارے کی تفسیر شیخ مصدق الدین کو املا کرائی، مگر بعد میں لوگوں کے اصرار پر یہ خیال ہوا ہوگا کہ پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جائے، چنانچہ انھوں نے سورہ بقرہ سے اس کو شروع کیا اور اٹھائیسویں پارے کے آخر تک پوری تفسیر لکھوا دی، پھر مختلف عوارض نے اس کام پر نظر ثانی کرنے اور اس کو آخری شکل دینے کی مہلت نہ دی اور معاملہ آجکل آجکل پر ٹلتا رہا، مگر تفسیر کا پہلا مسودہ تیار ہوچکا تھا، اس لیے اپنے خطوط میں اپنے احباب کو اس کا حوالہ دیتے رہے، جیسا کہ فتاوی کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ شاہ رفیع الدین مرادآبادی نے بھی یہی لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے تفسیر لکھی مگر وہ مسودہ بیاض تک نہیں پہنچی یعنی آخری شکل میں نہیں آیا، مگر مسودہ پورا ہوچکا تھا اس لیے شاہ صاحب اس کے اقتباسات اپنے احباب کو عندالضرورت لکھ دیتے تھے، لیکن مسودہ آخری شکل میں نہیں آیا تھا، اس لیے سب لوگوں تک یہ کتاب نہیں پہنچ سکی اور اس کی مختلف کاپیاں نہ ہوسکیں، غالباً شاہ صاحب کا خیال رہا ہوگا کہ اگر طبیعت سنبھل گئی تو اس پر نظر ثانی کرکے آخری شکل دیدیں گے، مگر اس کا موقع نہ مل سکا، اور یہ مسودہ آخری وقت تک اسی شکل میں پڑا رہا، اور لوگوں کو اس کا علم نہ ہوسکا، اسی لیے اکثر

تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف چند لوگوں ہی کو اس کا علم تھا، اسی دوران یہ
غالباً یہ بھی ہوا کہ شاہ صاحب کی وفات اور پھر شاہ اسحٰق صاحب اور شاہ محمد یعقوب صاحب
کی ہجرت کے بعد یہ اصل مسودہ کسی طرح ضائع ہوگیا، اور اس کا صرف اتنا ہی حصہ مل سکا جو آج
مطبوعہ شکل میں موجود ہے، غالباً یہی وجہ اس آخری جملے کے نامکمل رہ جانے کی ہے، ممکن ہے اس کی کوئی
کاپی مقالات طریقت کے شائع ہونے کے وقت تک جیسا کہ خود اس کے مصنف کا خیال ہے
اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود رہی ہو، مگر ناشروں کو صرف نامکمل اور ناقص کاپی مل سکی اسی کو انھوں نے
شائع کردیا، پورا مسودہ کچھ دنوں میں ضائع ہوگیا، اور چونکہ سورہ بقرہ کی اس آیت کے بعد سے تفسیر کا
کوئی حصہ نہ مل سکا اس لیے غالباً نواب سکندر جہاں بیگم نے مولانا حیدر علی فیض آبادی سے اس کا تکملہ لکھوایا
بہرحال جو صورت بھی ہوئی ہو، اغلب یہ ہے کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی، اس کے
بعد کیا ہوا، اس کا صحیح علم نہ ہو سکا، اس لیے اس سلسلے میں قیاس ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مولانا سید عبدالحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سامنے بھی غالباً مذکورہ بالا شواہد اور قرائن تھے
جن کی بنا پر انھوں نے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے قرآن مجید کی پوری تفسیر لکھی
تھی جس کا بیشتر حصہ غدر کے دوران ضائع ہوگیا، وہ اپنی معرکۃ الآرا تصنیف نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں:

واما مصنفاته فأشهرها تفسير القرآن المسمى بفتح العزيز صنفه في شدة المرض ونحول الضعف املاءً وهو في مجلدات كبار... ضاع معظمها في ثورة الهند وما بقي منها الا مجلدان من اول وآخر.

(نزہۃ الخواطر، جلد ۷، ص ۲۷۳)

ان کی تصنیفات میں سب سے مشہور ان کی قرآن شریف کی تفسیر ہے جس کا نام فتح العزیز ہے، اس تفسیر کو انھوں نے سخت بیماری اور ضعیفی کے زمانے میں املا کرایا تھا اور وہ ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی... جس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان کے غدر کے زمانے میں ضائع ہوگیا اور صرف شروع اور آخر سے دو جلدیں باقی رہ گئیں۔

ادبیات

غزل

از جناب حبیب احمد صاحب ممبر پبلک کمیشن

غم کیا جو اپنے جیب میں اک تار بھی نہیں — یہ غیرتِ جنوں کو سزاوار بھی نہیں
دل میں ہمارے اب خلشِ خار بھی نہیں — شاید ہمیں گلوں سے سروکار بھی نہیں
کیا جانیں ہم سے کس لیے دامن کشاں ہیں وہ — مدت سے ہم کرم کے طلبگار بھی نہیں
کچھ وجہ فخر ہو تو کرے کوئی فخر بھی — عرصے سے اب تو چشمکِ اغیار بھی نہیں
کیوں چرخِ فتنہ گر نے ہمیں منتخب کیا — ایسی تو ہم سے رونقِ بازار بھی نہیں
کمیابیٔ متاعِ محبت کا کیا ملال — دیکھا تو کوئی اس کا خریدار بھی نہیں
دنیا میں زندگی سے نہیں مطمئن کوئی — دنیا میں کوئی جینے سے بیزار بھی نہیں
اب اپنے منہ سے کیا کہیں اس کے سوا کہ ہم — زاہد نہیں تو ایسے گنہگار بھی نہیں
کچھ یہ بھی ہو کہ اس نے نہ پوچھا ہمارا حال — کچھ یہ بھی ہے کہ لائقِ اظہار بھی نہیں
اب دل میں آرزوئے گل و یاسمن کہاں — اب ذہن میں تصورِ گلزار بھی نہیں

کیوں ہے زمانہ برسرِ پیکار اے خدا
اب تو ہمارے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

غزل

از

جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

مردانِ کار ہوتے ہیں مرعوبِ زر کہیں
پیشِ بتانِ آزر بھی جھکتے ہیں سر کہیں ؟

پاتے ہیں چین آپ کے شوریدہ سر کہیں
جاتی بھی ہے یہ سوزشِ قلب و جگر کہیں ؟

کرنے لگے نہ کام زبان کا نظر کہیں
پردہ نہ دل کا فاش کرے چشمِ تر کہیں

غیرت کا نام لیتا ہے دریوزہ گر کہیں
دستِ طلب کے ساتھ بھی اٹھتا ہے سر کہیں

فکرِ علاج وہ بھی علاجِ مریضِ دل
دیوانہ ہو نہ جائے مرا چارہ گر کہیں

وہ آگ جس سے میرا نشیمن جلا ہے آج
کل پھونک دے نہ باغ کا اک اک شجر کہیں

خود خواہشِ ہلاکتِ دل کا سبب نہ ہوں
خود سوئے دام لے نہ چلیں بال و پر کہیں

اخفائے رازِ عشق اک امرِ محال ہے
چھپتی بھی ہے پیار میں ڈوبی نظر کہیں

آنکھوں سے پھر ٹپکنے لگے ہیں لہو کے بوند
پھر چبھ رہا ہے دل میں کوئی نیشتر کہیں

[1] اب گردشِ مدام سے گھبرا چکا ہے دل
شامِ غمِ حیات کی ہو بھی سحر کہیں

یادش بخیر ہم بھی گلستاں میں تھے کبھی
اپنا بھی آشیاں تھا کسی شاخ پر کہیں

دار و رسن کی پھر سے ہیں تیاریاں ولی
پھر لب کشا ہوا ہے کوئی باخبر کہیں

---

[1] غالب سے معذرت کے ساتھ۔

مطبوعاتِ جدیدہ

نذر عرشی - مرتبہ جناب مالک رام و مختار الدین احمد صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۵۷۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت تحریر نہیں۔

پتہ: مجلس نذر عرشی، نئی دہلی۔

مشہور مصنف اور فاضل محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی اکسٹھویں سال گرہ کے موقع پر ان کے احباب اور قدر دانوں نے ان کے علمی خدمات کے اعتراف میں یہ نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، اس میں عرشی صاحب کے علمی خدمات و کمالات اور دوسرے علمی موضوعوں پر ہند و پاک کے نامور اہل قلم کے مضامین ہیں، بیشتر مضامین اردو اور چند انگریزی کے ہیں، مضمون نگاروں میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی، ڈاکٹر سید عبد اللہ، ڈاکٹر شوکت سبزواری، مسعود حسین رضوی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، آل احمد سرور، شبیر احمد خاں غوری اور پروفیسر خلیق احمد نظامی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، شروع کے چار مضامین میں عرشی صاحب کی سیرت و شخصیت اور کمالات کی عکاسی کی گئی ہے، مالک رام صاحب نے ان کے خاندانی حالات و سوانح حیات کا جامع تذکرہ اور سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب نے علمی و ادبی کمالات کا مفصل جائزہ لیا ہے، اکبر علی خاں صاحب نے عرشی صاحب کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین و تصنیفات کی تاریخ وار فہرست اور ہر ایک کا مختصر تعارف کرایا ہے، یہ رسم یورپ کی ایجاد ہے گو مفید ہے، اس سے اہل کمال کے اعتراف کے ساتھ ایک مفید علمی مجموعہ مرتب ہو جاتا ہے،

یہ مجموعہ ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے قابل قدر ہے۔

نذرِ رحمٰن ۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ ترین ٹائپ صفحات ۳۸۴، مصور، مجلد مع گرد پوش قیمت تحریر نہیں،

پتہ: مجلس نذر رحمٰن، لاہور۔

یہ بھی نذرانۂ عقیدت ہے، جو پاکستان کے جسٹس شیخ عبدالرحمٰن کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے، جسٹس موصوف تنہا ماہر قانون ہی نہیں، علم و ادب کا بھی بلند مذاق رکھتے ہیں، وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں اور متعدد علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں کے سرپرست ہیں، ان خدمات و کمالات کے اعتراف میں انکے احباب و عقیدتمندوں نے یہ علمی ارمغان انکی خدمت میں پیش کیا ہے، اس میں جسٹس رحمان کے ذاتی حالات و کمالات کے علاوہ مفید اور اہم علمی موضوعوں پر پنجاب کے مشاہیر اہل قلم کے مضامین ہیں۔ دو مضمون "مسلمان اور تاریخ سائنس"، اور "سعدی معلم اخلاق کی حیثیت سے" انگریزی، ایک مضمون "تلفظ ایرانی در اشعار امیر خسرو" فارسی اور باقی سب اردو میں ہیں، ان میں "ابن عربی کا فلسفہ" بشیر احمد ڈار، "پائے نسبت اردو میں"، ڈاکٹر شوکت سبزواری "خط کی کہانی مخطوطات کی زبانی"، ڈاکٹر سید عبداللہ "ظفر خاں اور اس کا مصور کلام"، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، "شخصیات کلام اکبر کے آئینہ میں"، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، آخر میں تین مختلف عنوانات کے تحت اشعار کا انتخاب ہے، شروع میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے دلچسپ و شگفتہ مضمون میں شیخ صاحب کی سیرت و شخصیت کے بعض پہلوؤں کو دکھایا ہے، یہ مجموعہ بھی علمی حیثیت سے مطالعہ کے لائق ہے۔

برنامج شیوخ الرعینی ۔ تالیف ابوالحسن علی بن محمد رعینی اشبیلی، ترتیب استاد ابراہیم شبوح، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، قیمت ۳ لیرات۔ پتہ: وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی، دمشق۔

ساتویں صدی ہجری کے فاضل و مصنف ابوالحسن علی بن محمد بن علی اشبیلی رعینی المعروف بابن فخار نے اس کتاب میں اپنے شیوخ کا تذکرہ لکھا ہے، اس کے دو قلمی نسخے خیرالدین زرکلی اور اسکوریال کے کتب خانوں میں تھے، ان کی مدد سے دمشق کے استاذ ابراہیم شبوح نے اس کو ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، اس میں رعینی نے ۱۱۲ اصحاب علم و فن سے اپنے استفادہ، ان سے روایت کی اجازت اور ان کے مختصر تذکرے اور کمالات بیان کیے ہیں، اس سلسلہ میں مغرب کے بہت سے قراء، محدثین، مفسرین، فقہا، نحاۃ، علمائے لغت و ادب اور شعراء، مختلف طبقوں کے لوگوں کا ذکر آگیا ہے۔ اس کتاب سے اس عہد کی تہذیب، طرز تعلیم، مختلف اساتذہ کے طریقۂ درس اور دوسرے متعدد مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، شروع میں مقدمہ کے اندر کتب برامج کی قسموں اور ان کی تصنیف کے مختلف طریقوں، رعینی کے حالات، اس کتاب اور اس کے دونوں مخطوطات کے متعلق معلومات درج ہیں، ہر نسخہ کے کئی صفحوں کے عکسی فوٹو اور مختصر حواشی میں اختلاف نسخ، بعض دقیق الفاظ کے معنی اور صاحب ترجمہ کے حالات کے لیے دوسری کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں، آخر میں مختلف فہرستیں ہیں۔

سیرت بایزید ۔ مرتبہ جناب پروفیسر فضل احمد عارف ایم اے، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۷۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت [illegible]۔ پتہ: سنگ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار، لاہور ۲۔

اس کتاب میں تیسری صدی ہجری کے مشہور بزرگ اور عارف باللہ حضرت بایزید بسطامی کے پاکیزہ سیرت و سوانح اور عشق و محبت الٰہی کے مؤثر واقعات تحریر کیے گئے ہیں، جو تین حصوں میں ہے، پہلے میں ان کے خاندان، تعلیم و تربیت، ریاضات و مجاہدات، ولایت، احترام و اتباع شریعت اور اخلاق و عادات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، دوسرے میں انکے ممتاز معاصرین

صوفیا اور مسترشدین کے اعترافات سے ان کی عظمت و مقبولیت دکھائی گئی ہے، اور حضرت بایزیدؒ سے ان کے استفادہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے، تیسرے میں ان کے اعمال و اشغال اور اقوال و احوال کی تفصیل ہے، اردو میں حضرت بایزیدؒ کے حالات میں یہ پہلی مفصل و مستند کتاب ہے، فاضل مرتب کو صوفیا سے گہرا تعلق ہے اور وہ خود بھی بادۂ تصوف کے لذت شناس ہیں، اس کا اثر اس کتاب میں نمایاں ہے۔

تذکرۃ الموتیٰ والقبور - تصنیف قاضی ثناء اللہ پانی پتی، ترجمہ مولانا اقبال الدین احمد کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۴، قیمت ۱۲/ پتہ: واحد بک ڈپو جونا مارکیٹ کراچی ۲۔

ہندوستان کے مشہور عالم اور نامور فقیہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی مرحوم کے مشہور فارسی رسالہ تذکرۃ الموتیٰ والقبور کا اردو ترجمہ ہے، جو عالم آخرت کی پہلی منزل یعنی موت و قبر کے احوال و امور سے متعلق روایات و احادیث اور ان کے تشریح و افادہ پر مشتمل ہی، گو اس میں بعض غیر مستند حدیثیں بھی نقل ہو گئی ہیں اور تشریح میں صوفیا کے بعض شطحیات کا بھی ذکر ہے، تاہم زیر بحث مضمون کی اکثر متفرق حدیثوں کو جو جدا جدا ابواب میں مختلف کتابوں کے اندر منتشر تھیں، اس میں یکجا کر دیا گیا ہے، ان کی واقفیت ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

مشکوٰۃ الانوار - از امام غزالیؒ، ترجمہ مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۴، قیمت عہ/ دو پیسے۔ پتہ: واحد بک ڈپو جونا مارکیٹ کراچی ۲۔

یہ رسالہ امام غزالیؒ کے ایک رسالہ کا جو انھوں نے انوار الٰہی کے متعلق ایک سائل کے جواب میں تحریر فرمایا تھا، اردو ترجمہ ہے، یہ تین ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں نور خداوندی کی تشریح

اس کی حقیقت و اقسام اور دوسرے نکات و فوائد بیان کیے گئے ہیں، دوسرے میں سورۂ نور کی آیت اللہ نور السمٰوات والارض الخ کی توضیح، اس کی تمثیل کے طرز و اسرار اور مشکوٰۃ، مصباح و زجاجہ کی تشریح کی گئی ہے، تیسرے باب میں ایک حدیث ان اللہ سبعین حجابا الخ کی وضاحت ہے، امام صاحب کی دوسری تصنیفات کی طرح یہ رسالہ بھی علمی دقائق پر مشتمل اور فلسفیانہ و متصوفانہ انداز میں لکھا گیا ہے، اس لیے خواص ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ترجمہ سلیس ہے۔ فاضل مترجم نے حواشی میں کہیں کہیں مصنف کے نقطۂ نظر سے اختلاف، ان کے مبہم خیالات کی توضیح اور رسالہ میں درج روایات کی قوت و ضعف کا بھی ذکر کیا ہے۔

درج الدرر فی احادیث خیر البشر - مرتبہ حافظ علی احمد صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۸، قیمت تحریر نہیں، پتہ: ناظم مکتبہ الحسن بازار یکہ توت، پشاور شہر۔

حضرت سید شاہ محمد غوث پشاوریؒ (م ۱۱۵۲ھ) ایک صاحب سلوک و ارشاد بزرگ اور باکمال محدث و مصنف تھے، ان کی علمی یادگاروں میں ایک مختصر عربی رسالہ اصول حدیث ہے، اس کو صاحبزادہ حافظ علی احمد صاحب نے مزید اضافوں کے ساتھ اردو میں شائع کیا ہے، اس کے پہلے حصہ میں اصول و اصطلاحات حدیث کی تعریف کی گئی ہے، اور کتب حدیث کے اقسام و طبقات کا ذکر کیا گیا ہے، نیز باہم مشابہ اور ہمنام رواۃ کا التباس رفع کیا گیا ہے، اور معلم و متعلم حدیث کے آداب بیان کیے گئے ہیں، دوسرے میں چند اکابر محدثین اور ائمۂ فن کا مختصر تذکرہ ہے، آخر میں شاہ محمد غوث کے عربی رسالہ کا متن اور ان کے مختصر حالات تحریر کیے گئے ہیں، یہ رسالہ حدیث و اصول حدیث کے متعلق بڑے مفید اور ضروری معلومات پر مشتمل ہے، اور فن حدیث کے طلبہ کے مطالعہ کے لائق ہے لیکن زبان و بیان کا معیار پست ہے۔

آداب اردو - مرتبہ جناب حکیم گلچیں کرنالی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۲۰۸ قیمت عـ ۵۰ پیسے پتہ: اردو شن، گلی تیراں والی، ملتان۔

حکیم گلچیں کرنالی صاحب نے صحیح اردو بولنے اور لکھنے کی تعلیم دینے کے لیے یہ مفید کتاب لکھی ہے، اس لیے اس میں اردو کے ضروری اصول وقاعدے مثلاً روزمرہ محاورہ اردو میں غیر زبانوں کے الفاظ کے استعمال اور جمع بنانے کے طریقے، تذکیرہ تانیث، عطف واضافت اور دوسرے نحوی و صرفی مسائل، دوسری زبانوں کے اصطلاحی الفاظ کے اردو ترجمے بعض الفاظ کی وضاحت و تحقیق، ان کے غلط استعمال کی تردید وغیرہ مختلف ضروری اور مفید باتوں کا ذکر کرکے تلفظ وصحتِ زبان کی اہمیت ظاہر کی گئی ہے، ایک مستقل عنوان کے تحت اردو کے بعض مشہور ومستند ادیبوں کے زبان وبیان پر نقد واحتساب کیا گیا ہے اور ان کی کتابوں کے غلط فقرے اور جملوں کی تصحیح کی گئی ہے، لیکن خود مصنف سے بھی فروگذاشتیں اور بعض الفاظ وجملوں کی وضاحت میں سہو ہوا ہے، ان کا نقد واحتساب بھی صحیح وغلط دونوں کا مجموعہ ہے، تاہم اس کتاب سے اردو کے متعلق گوناگوں اور مختلف مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور مصنف کا مقصد بھی نیک ہے، یہ کتاب خصوصیت سے زبان وادب کے طلبہ کے مطالعہ کے لائق ہے۔

فرداب ورتاب - از جناب برق موسوی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۴۴ قیمت عـ پتہ: مرکز ادب حیدرآباد، آندھرا پردیش،

برق موسوی صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں، یہ ان کی ۱۰۰ سے زائد رباعیوں کا مجموعہ ہے، جو زیادہ تر حکیمانہ خیالات، امن وصلح، محبت واخوت اور رواداری وغیرہ مفید مضامین پر مشتمل ہیں، رباعی میں جو ایک مشکل صنفِ سخن ہے، طبع آزمائی کرنا مصنف کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے، میر احمد علی قادری صاحب نے مقدمہ میں ان کی رباعی نگاری کے خصوصیات تحریر کئے ہیں۔

"ض"

جلد ۱۰۰ ماہ جمادی الثانی ورجب المرجب ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۷ء - عدد ۴

مضامین